اسلام اور تکریمِ انسانیت کے اصول

ریڈ کراس اور ہلالِ احمر تحریک کے بنیادی اصول اور اسلامی نقطۂ نظر

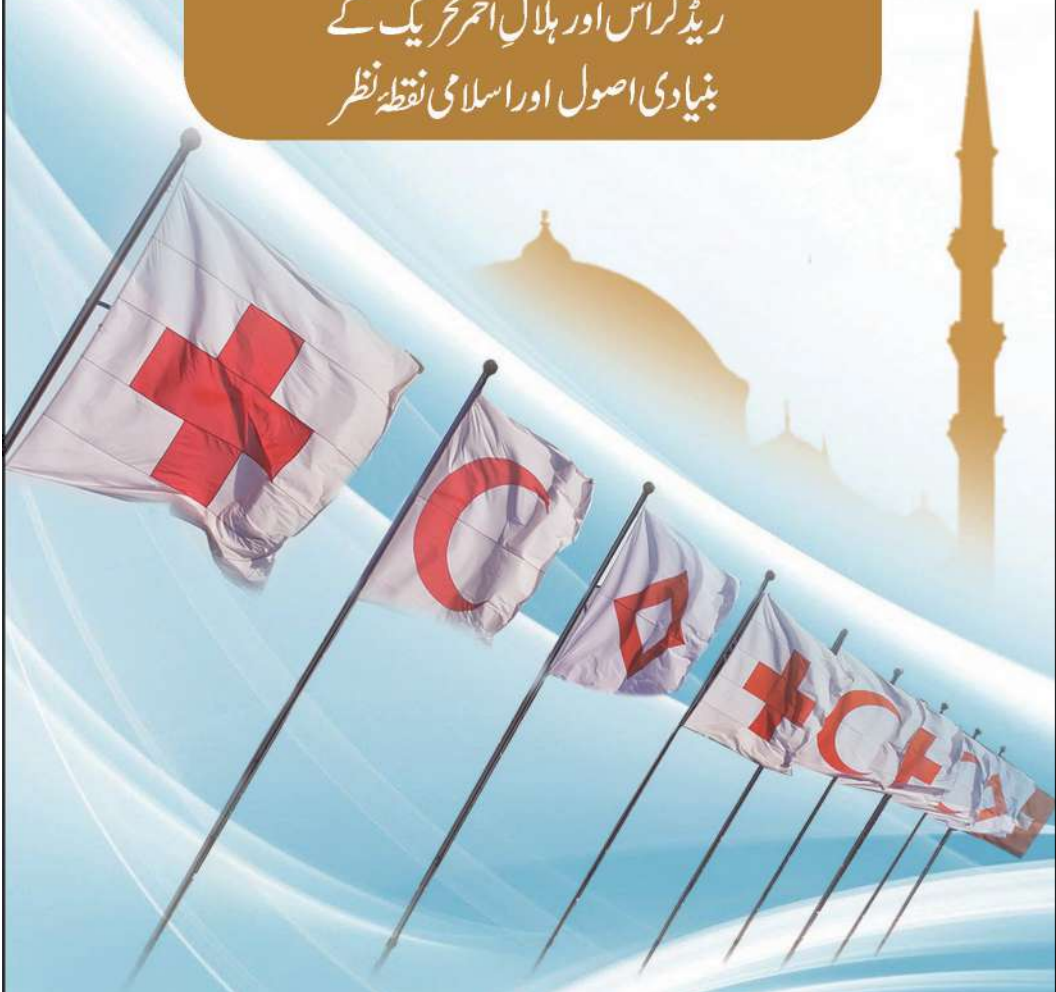

سیّد ندیم فرحت
ڈاکٹر ضیاء اللہ رحمانی

COMITE INTERNATIONAL GENEVE
PRESS

اسلام اور تکریمِ انسانیت کے اصول

ریڈ کراس اور ہلالِ احمر تحریک کے بنیادی اصول

اور

اسلامی نقطۂ نظر

سیّد ندیم فرحت

ڈاکٹر ضیاءاللہ رحمانی

COMITE INTERNATIONAL GENEVE

PRESS

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد کی تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کے کسی حصے کی نقل یا اشاعت، کسی بھی شکل میں اسٹور ریج، جہاں سے اسے دوبارہ حاصل کیا جاسکتا ہو یا کسی بھی شکل میں ترسیل نہیں کی جاسکتی۔

جملہ حقوق محفوظ ۲۰۲۱ء

کتاب: اسلام اور تکریمِ انسانیت کے اصول

تالیف وتدوین: سیّد ندیم فرحت، ڈاکٹر ضیاءاللہ رحمانی

اشاعت: ۲۰۲۱ء

آئی ایس بی این: ۹۷۸-۹۶۹-۴۴۸-۷۹۵-۳

زیرِاہتمام:

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، نصر چیمبرز، پلاٹ ۱، کمرشل سنٹر،
ایم پی سی ایچ ایس، ای الیون تھری—اسلام آباد
فون: ۸۴۳۸۳۹۱-۳، فیکس: ۸۴۳۸۳۹۰، ای میل: publications@ips.net.pk

ویب سائٹ: www.ipsurdu.com, www.ips.org.pk

فیس بک: InstituteOfPolicyStudiesPakistan

سرورق: آصف تیموری

صفحہ سازی: عابد حسین

طباعت: گیلیکسی پرنٹرز، لاہور

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد تحقیق کے لیے آزادانہ اظہارِ خیال کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ ادارہ کی مطبوعات میں پیش کیے گئے تمام خیالات سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں۔

سرورق پر نظر آنے والے پرچموں پر موجود ریڈ کراس، ریڈ کریسنٹ اور ریڈ کرسٹل، ریڈ کراس اور ریڈ کریسنٹ کی بین الاقوامی تحریک کے تسلیم شدہ نشانات ہیں۔

فہرست

•	ابتدائیہ	۵
•	پیش لفظ	۱۱
باب ۱	ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کا آغاز وارتقاء	۱۷
باب ۲	بنیادی اصول کی اہمیت اور ضرورت	۲۹
باب ۳	انسانی اقدار میدانِ عمل میں	۵۷
باب ۴	اسلام میں اصول ومعیارات برائے تکریمِ انسانیت	۶۹
باب ۵	اسلام میں تکریم وخدمتِ انسانیت کے چند عملی مظاہر	۸۹
باب ۶	پاکستان میں خدمتِ خلق اور اصول برائے تکریمِ انسانیت	۱۰۹
•	دوروزہ قومی کانفرنس میں پیش کردہ مقالات اور دیگر مصادر ومراجع	۱۲۵

تکریمِ انسانیت کے سات بنیادی اصول

انسانیت

غیر جانبداری

غیر وابستگی

اتحاد

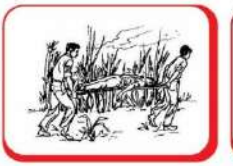

رضا کارانہ خدمت

خود مختاری

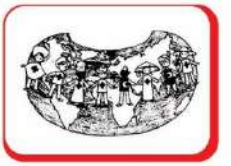

عالمگیریت

ابتدائیہ

الحمدللہ رب العالمین و الصلوۃ والسلام علی رسولہ الکریم

بین الاقوامی ریڈ کراس کمیٹی (آئی سی آر سی) ایک انسان دوست تنظیم ہے جس کا قیام ۱۸۶۳ میں سوئیٹزرلینڈ سے تعلق رکھنے والے فلاحی سوچ رکھنے والے چند افراد عمل میں لائے۔ بعد میں بڑھتے بڑھتے یہ ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئی جس کو ریڈ کراس اور ریڈ کریسنٹ کی بین الاقوامی تحریک کا نام دیا گیا۔ اس تحریک کے تین عناصر ہیں۔ اول: آئی سی آر سی جس کا کام جنگوں اور تشدد کے واقعات میں متاثرین کی مدد کرنا اور جنگ سے ہونے والے نقصانات میں ممکنہ حد تک کمی کرنے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی قانونِ انسانیت (International Humanitarian Law) کی ترویج و اشاعت کرنا ہے۔ دوم: ریڈ کراس اور ریڈ کریسنٹ کی قومی انجمنیں جن کا کام اپنے اپنے ملک میں صحت کے حوالے سے خدمات انجام دینا اور قدرتی آفات کے موقع پر امداد فراہم کرنا ہے۔ سوم: ریڈ کراس اور ریڈ کریسنٹ کی انجمنوں کی بین الاقوامی فیڈریشن (آئی ایف آر سی) جس کی ذمہ داری قومی انجمنوں کے کام کو مربوط و منضبط کرنا ہے۔ تحریک کے یہ تین عناصر ہر چار سال بعد ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کرتے ہیں جس میں یہ تحریک کے کام کا جائزہ لے کر آئندہ کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے۔

اس تحریک کی ابتدا آئی سی آر سی کے قیام سے ہوئی اور آئی سی آر سی کا مقصد شروع سے ہی غیر جانبدارانہ انسانی خدمات ہیں۔ یہ بھی اس تحریک کا امتیاز ہے کہ اس کی ابتدا تو

یورپ کے اندر مسیحی ممالک میں ہوئی لیکن جلد ہی اس میں خلافت عثمانیہ اور ایران کی شرکت سے مسلمان بھی اس کا حصہ بن گئے اور مرور زمانہ کے ساتھ دوسرے مذاہب اور خطوں سے تعلق رکھنے والے ممالک بھی اس میں شامل ہو گئے، لہٰذا اس کے کام کو سب کے لیے قابلِ قبول بنانے اور اپنے بنیادی مقصد سے مربوط کرنے کی خاطر تحریک نے شروع ہی سے ایسے اصول وضع کیے جن پر عمل کر کے اس خالص انسانی خدمت کے کام کو کسی بھی ایسے انحراف سے بچایا جاسکے، جس سے تحریک کے اس بنیادی مقصد پر آنچ آتی ہو اور مذہب، رنگ، نسل یا علاقے کی بنیاد پر ہر قسم کے تعصبات سے اس کو دور رکھا جاسکے۔ ان اصولوں کو تکریمِ انسانیت کے اصول (Humanitarian Principles) کہا جاتا ہے۔

اصولِ تکریمِ انسانیت ایک بہت ہی وسیع اصطلاح ہے جس کا مقصد اس کتاب کی حد تک تحریکِ ریڈ کراس و ریڈ کریسنٹ کے سات اصول (انسانیت، غیر وابستگی، غیر جانبداری، خود مختاری، رضاکارانہ خدمت، اتحاد اور عالمگیریت) ہیں جو تحریک کے دستور کا نافذ العمل حصہ ہیں۔ ویسے تو شروع دن سے ان اصولوں کی روح تحریک کے کام میں شامل رہی، لیکن باقاعدہ طور پر یہ اصول ۱۹۵۶ء میں بین الاقوامی ریڈ کراس کمیٹی (آئی سی آر سی) کے ڈائریکٹر برائے امورِ عامہ جین پکٹے (Jean Pictet) نے تجویز کیے جن کو ویانا (آسٹریا) میں منعقدہ تحریک کی بین الاقوامی کانفرنس نے ۱۹۵۶ء میں اپنے دستور کا حصہ بنایا۔

۱۹۸۶ء میں ان اصولوں کو اس تحریک کے دستور کے نافذ العمل حصے کے طور پر شامل کیا گیا۔ چونکہ ان اصولوں میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اسلامی تعلیمات سے متضاد ہو اس لیے تحریک میں شامل مسلمان ممالک نے بھی اس کی پُرزور حمایت کی۔ لہٰذا اس کے بعد سے کسی بھی ملک کی قومی انجمن کو تسلیم کرنے کا معیار انہی اصولوں کو بنایا گیا اور آئی سی آر سی کو ان

اصولوں کی ترویج و اشاعت کی ذمہ داری دی گئی۔ تحریک کے دستور کے مطابق جنیوا معاہدات میں شامل تمام ریاستیں اس بات کی پابند ہیں کہ جنگ وامن دونوں حالتوں میں ان اصولوں کی پاسداری کریں۔

آئی سی آر سی ان اصولوں کی ترویج واشاعت مختلف ذرائع سے کرتی رہی ہے،اور اس کی کوشش یہ رہی ہے کہ ان اصولوں کے اندر بذاتِ خود جو آفاقیت ہے،اس کو نمایاں کیا جاسکے تاکہ مختلف تہذیبوں اور ادیان کے ماننے والے ان کو ایک مشترکہ ورثہ کے طور پر برتیں اور محض مغربی دنیا سے آئے ہوئے دوسرے نظریات کی طرح نہ سمجھیں۔ چونکہ آئی سی آر سی کے کام کا بڑا حصہ مسلم ممالک کے اندر ہے اس لیے اس نے کچھ عرصہ قبل یہ فیصلہ کیا کہ بین الاقوامی قانونِ انسانیت اور اصولِ انسانیت کو اسلامی دنیا کے دینی اداروں اور شخصیات کے سامنے رکھا جائے اور ان معاملات پر متعلقہ اداروں اور اہلِ علم کا نقطۂ نظر معلوم کیا جاسکے۔ اس سلسلے میں مسلمان اہلِ علم کے ساتھ مقامی سطح پر بحث و تمحیص کے علاوہ قومی اور بین الاقوامی سطح کے پروگرام منعقد کیے گئے۔ پاکستان میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی نے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ۲۰۰۴ء اور پھر ۲۰۱۴ء میں اسلامی یونیورسٹی اور آئی سی آر سی کے اشتراک سے دو بین الاقوامی کانفرنسیں ہوئیں جن میں جنگ کے حوالے سے بین الاقوامی قوانین اور انسانی خدمات کے حوالے سے غیر جانبداری اور آزادی کے اصولوں کو اسلام کے تناظر میں موضوعِ بحث بنایا گیا۔ ۲۰۰۴ کے دوران اسلام آباد میں منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس اس سفر میں ایک اہم سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ دوروزہ کانفرنس بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے سابق صدر ڈاکٹر محمود احمد غازی مرحوم کے زیر سرپرستی ہوئی جس میں عالم اسلام کے معروف شامی عالم

مرحوم ڈاکٹر وھبہ الزحیلی سمیت سعودی عرب و دیگر ممالک سے اہم علماء کرام نے شرکت کی اور پہلی دفعہ یہ بات زور دے کر کہی گئی کہ جنگ و امن کے دوران انسانی خدمات کے حوالے سے بین الاقوامی قوانین کو شریعت کی روشنی میں نمایاں کرنے کا کام عالم اسلام کے دینی و تعلیمی اداروں میں ترجیحاً ہونا چاہیے۔ اس کانفرنس کے بعد جنیوا میں قائم آئی سی آر سی کے صدر دفتر میں تنظیم کے ذمہ داران اور مسلمان علماء کے درمیان ایک مشاورت بھی منعقد ہوئی جس میں مرحوم ڈاکٹر غازی شریک ہوئے۔ اس کے بعد اس کام کو آگے بڑھانے کے لیے عالم اسلام کے مختلف اداروں سے مل کر سیمینار اور کانفرنسز کا انعقاد کیا جاتا رہا۔ اس سلسلے میں ۲۰۰۶ء کے دوران افغانستان اور ایران میں علماء کے ساتھ پروگرام ہوئے، اس کے علاوہ اسلامی یونیورسٹی چٹاگانگ، اسلامی یونیورسٹی یوگنڈا، جامعۃ الازھر، جامعہ زیتونہ تیونس اور اسلامی سربراہی کانفرنس کے ہیڈکوارٹر جدہ میں اسی نوعیت کے پروگرام منعقد ہوئے۔ پاکستان میں دو بین الاقوامی کانفرنسز کے علاوہ مختلف جامعات و مدارس کے ساتھ مل کر سیمینار اور تربیتی کورسز کا انعقاد کیا گیا۔ اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز (آئی پی ایس) اور آئی سی آر سی نے ۲۰۱۹ء میں ایک دو روزہ سیمینار میں پاکستان بھر سے اہلِ علم کے ایک منتخب گروہ کو اکٹھا کیا اور اسلام اور اصولِ تکریمِ انسانیت کو غور و فکر کا موضوع بنایا۔

زیرِ نظر کتاب کی بنیاد اس دو روزہ کانفرنس کے دوران مذکورہ موضوع پر بحث و تمحیص بنی۔ اس کی تالیف میں کانفرنس کے دوران پڑھے گئے مقالات کے علاوہ متعلقہ موضوعات پر پہلے سے دستیاب مواد سے مدد لی گئی۔ اپنے موضوع پر اردو زبان میں شاید یہ پہلی کوشش ہے، اس لئے ہر کام کی طرح اس میں بہتری کی گنجائش ضرور موجود رہے گی۔

بایں ہمہ اگر یہ اس موضوع پر ایک بامقصد گفتگو اور تحقیقی کام کی ابتدا بھی ثابت ہو جائے تو ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے۔ مجھے قوی امید ہے کہ یہ اس سلسلے کی آخری کوشش نہیں ہو گی اور آئندہ آنے والے ماہ و سال میں اس موضوع پر مزید گفتگو اور تحقیق کے دروازے کھلیں گے۔

کتاب کی تالیف میں بنیادی کام برادر ندیم فرحت گیلانی کا ہے جنھوں نے خرابیٔ صحت کے باوجود اس پر خاصی محنت کی، اللہ تعالی ان کو جزائے خیر دے۔ ڈی جی آئی پی ایس خالد رحمٰن صاحب کی فراخدلانہ سرپرستی اور پسِ منظر میں کام کرنے والی آئی پی ایس کی ٹیم خاص طور پر برادر سردار علی یوسفزئی اور برادر نوفل شاہ رُخ کی انتظامی صلاحیتوں کے بغیر کانفرنس کا انعقاد اور اس کام کی تکمیل ممکن نہ ہوتی، ان سب کا بے حد شکریہ۔ اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔

ڈاکٹر ضیاءاللہ رحمانی
سینیئر پروگرام آفیسر
آئی سی آر سی، پاکستان

پیش لفظ

انسانی تاریخ میں جنگیں بھی اتنی ہی پرانی ہیں جتنی خود انسانی تاریخ۔ اسی طرح جنگوں کو روکنے کی کوشش بھی اسی قدر پرانی ہے۔ لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ آج تک انسان اس کوشش میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہو سکا۔ یہ ایک الگ موضوع ہے کہ ایسا کیوں ہے لیکن شاید مستقبل میں بھی ایسا ممکن نہیں ہے کہ جنگ ہمیشہ کے لیے رُک جائے۔ اس لیے اس مقصد میں ناکامی کے بعد دردِ دل رکھنے والے انسانوں کی اگلی کوشش ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ جنگ ہونے کی صورت میں اس کے نقصانات کو کم سے کم کیا جائے۔

جنگ کرنے والے فریق تو فتح حاصل کرنے یا انتقام کے شوق میں ایک دوسرے کو بالکل تباہ ہی کر دینا چاہتے ہیں، لیکن وقت کے ساتھ یہ احساس بڑھا ہے کہ عام افراد کو بھی تماشائی بننے کی بجائے منظم انداز میں آگے بڑھ کر تباہی کم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے اور بالخصوص ان لوگوں کے تحفظ کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے جو جنگ کا باقاعدہ حصہ نہیں ہیں۔ دنیا بھر میں تسلیم کیے جانے والے جنگی قوانین، ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کی عالمگیر تحریک اور خود تکریمِ انسانیت کے وہ سات اصول جن پر یہ تحریک کاربند ہے، دراصل ایسے ہی لوگوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے جن کے نزدیک انسانی جان کی حرمت اہم ہے۔ اسی تناظر میں انٹرنیشنل کمیٹی آف ریڈ کراس، ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کی قومی انجمنیں اور ان کی بین الاقوامی فیڈریشن کا ارتقاء جنگی قوانین کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ہوتا رہا ہے۔

جنگ کے مسلسل تبدیل ہوتے ہوئے انداز واطوار نے ہر دور میں انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ جو اصول اور قواعد پہلے مرتب کر لیے گئے ہیں، ان کو جدید رجحانات، حالات اور آلات و وسائلِ حرب کے مطابق کیسے مزید بہتر بنایا جائے۔ اس لیے اگرچہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہونے سے متعلق معروف کہاوت کے برعکس جنگ کو چند ضابطوں کا پابند بنانے اور مظلوموں کی مدد کی کاوشیں ہزاروں سال پرانی ہیں، پچھلے ڈیڑھ سو سال میں انہوں نے ایک مرتب شکل اختیار کی ہے۔ اس ڈیڑھ سو سال کی تاریخ پر غور کیا جائے تو موجودہ انتظام کی بنیاد میں بھی اور اس کی ترقی و تشکیل کے پس منظر میں بھی اس دور میں ہونے والی جنگوں کا اہم کردار ہے۔ ایسے تمام مراحل پر تکریمِ انسانیت کے بنیادی اصول راہنمائی کا کام دیتے رہے ہیں۔ اس اعتبار سے ۱۹۴۹ء کے چار جنیوا کنونشن اپنے وقت کے لحاظ سے جامعیت کے حامل تھے لیکن ۱۹۷۶ء میں دو پروٹوکول کا اضافہ کر کے ان میں بدلتی دنیا کے رجحانات کے مطابق اہم پہلوؤں کا احاطہ کیا گیا۔

جنگ اور تصادم نے موجودہ دنیا میں بالکل نیا انداز اختیار کر لیا ہے۔ موجودہ دور کی جنگوں کا ایک انتہائی تکلیف دہ پہلو یہ ہے کہ متعدد طاقتور اور مادی ترقی کے حامل ممالک اپنے مفادات کی جنگیں دوسرے ممالک میں جا کر لڑتے ہیں۔ ان جنگوں میں فیصلہ سازی بھی کہیں اور ہو رہی ہوتی ہے اور جنگ کا اصل فائدہ بھی کوئی اور اٹھا رہا ہوتا ہے لیکن جنگ کا میدان ایک ایسا ملک بنتا ہے جس کے اندر موجود تقسیم کو بڑھاوا دے کر طاقتور ممالک اپنے تزویراتی اہداف حاصل کرتے ہیں۔ ایسی جنگوں میں کبھی تو ریاست بھی ایک فریق ہوتی ہے اور کبھی مختلف گروہ برسرِپیکار ہوتے ہیں، جب کہ بڑی طاقتیں اس تنازع میں کبھی واضح اور

کبھی خفیہ لیکن فعال کردار ادا کر رہی ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ ٹیکنالوجی کے بڑھتے ہوئے استعمال نے ایسے متعدد سوالات پیدا کیے ہیں جن کا جواب موجودہ قوانین میں موجود نہیں۔

جنگ کی نوعیت میں اس مسلسل تبدیلی کے ساتھ ساتھ ظاہر ہے کہ یہ بحث بھی مسلسل جاری رہتی ہے کہ تکریمِ انسانیت کے اصولوں اور ان کی روشنی میں جاری رضاکارانہ سرگرمی کی نوعیت کو کس طرح تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس حوالے سے ایک بڑا چیلنج تو یہ ہے کہ جارحانہ کارروائیاں، حتیٰ کہ صریح مظالم بھی، انسانیت اور اس کی فلاح کے نعرے اور دعوے کے ساتھ جاری ہیں۔ جب کہ ایک ستم ظریفی یہ بھی ہے کہ مسلح کارروائیوں میں شامل اور مصروف قوتیں ہی انسانی ہمدردی کے نام پر امدادی و فلاحی سرگرمیاں بھی انجام دے رہی ہوتی ہیں، جن کے حوالے سے ہمیشہ یہ امکان رہتا ہے کہ امدادی کاروائیوں کی آڑ میں سیاسی و تزویراتی مقاصد کے حصول کی کوشش کی جارہی ہو۔

ان حالات میں قوانین اور حکمتِ عملی میں بہتری لانے، اور قوانین جن بنیادوں پر چل رہے ہیں ان پر مسلسل غور و فکر کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم ضرورت یہ بھی ہے کہ قوانین کو انسانیت کی مشترکہ کاوش کے نتیجے میں اور مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے امتزاج سے انسانیت کی مجموعی میراث کے طور پر ترقی دی جائے اور اس میں اس تاثر کو دور کرنے کی کوشش کی جائے کہ یہ قوانین اور اصول مخصوص مغربی پس منظر کے حامل ہیں۔ اسی طرح یہ بات بھی بار بار دہرائے جانے کے قابل ہے کہ تکریمِ انسانیت کے سات اصول جو ریڈ کراس اور ہلالِ احمر تحریک نے اپنے سامنے رکھے، یہ ایسے انسانی اوصاف کا اظہار ہیں جو ہر مہذب معاشرے، مذہب اور نظریئے میں محترم ہیں۔

اس تناظر میں اسلام اور اصولِ تکریمِ انسانیت کا عنوان بہت اہم ہے۔ اس موضوع پر گفتگو کی اہمیت ایک تو اس لیے بھی ہے کہ ان اصولوں اور ان کے تحت دنیا بھر میں جاری سرگرمیوں کو اسلام کے تناظر میں پیش کیا جا سکے اور اس لیے بھی کہ اس بات کا جائزہ لیا جا سکے کہ ایسے حالات میں جب دنیا کے موجودہ بہت سے تنازعات میں یا تو دونوں فریق ہی مسلمان ہیں یا ان میں سے ایک مسلمان ہے، قانون کے ارتقاء میں مسلم اقوام اور اہلِ علم کا عمومی کردار بڑھانے اور مسلم معاشرت و تہذیب کی روشنی میں جدید مسائل کا حل پیش کرنے کی جانب پیش رفت ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ دنیا میں موجود بداعتمادی اور پاور پالیٹکس کے ماحول میں یہ حیران کن نہیں ہے کہ ریڈ کراس کی عالمی تحریک کو بھی کئی طبقات ایک مغربی ایجنڈے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ لیکن ایک ایسا نظام جس میں تمام ممالک اور اقوام کے لیے شرکت کے مواقع موجود ہیں، اس میں شفافیت پیدا کرنا، اس کے بارے میں بہتر آگاہی حاصل کرنا، آگے بڑھ کر اس کی سرگرمیوں کو ایسا رخ دینے میں مدد کرنا جو اس کے اعلان کردہ مقاصد کے قریب تر ہو اور سب سے بڑھ کر بین الاقوامی نظام اور قانون میں بحیثیت مجموعی ایک فعال اور مؤثر کردار ادا کرنا ہی وہ راستہ ہے جس سے نہ صرف ان شکوک و شبہات کا ازالہ ہو گا بلکہ انسانوں کی بھلائی کے لیے مل کر کام کرنے سے انسانیت بحیثیتِ مجموعی مستفید ہو گی۔

تمام معاشروں اور معاشرے کے تمام طبقات کی اس حوالے سے آگہی اور شراکت اس لیے بھی ضروری ہے کہ ریڈ کراس اور ہلالِ احمر تحریک کا دائرۂ عمل صرف جنگی حالات تک محدود نہیں ہے بلکہ قدرتی آفات سے نمٹنے میں بھی اس تحریک سے وابستہ اور انسانی ہمدردی کے جذبے سے سرشار دیگر افراد و ادارے اکثر اپنا حصہ ڈالتے ہیں۔ اس کے ساتھ

ساتھ امن کے دور میں بھی یہ تحریک کسی ممکنہ تباہی کا راستہ روکنے اور اس سے بچاؤ کے لیے اجتماعی تیاری میں ہمہ وقت سرگرم رہتی ہے۔

درحقیقت اگر روز مرہ زندگی میں معاشروں میں تکریمِ انسانیت کے اصولوں اور بالخصوص اصولِ انسانیت کو رواج دے دیا جائے تو جنگ کے امکانات بھی کم ہو جائیں گے اور دیگر آفات میں بھی رضاکارانہ خدمت کے راستے کھل جائیں گے۔ امن کے دور میں کام کے حوالے سے کام کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ چونکہ ہر جنگ کو قومی مفاد کے عنوان سے شروع کیا جاتا اور جاری رکھا جاتا ہے، اس لیے اگر یہ تعلیم عام کی جاسکے اور یہ شعور پیدا کیا جاسکے کہ قومی مفاد کی بجائے انسانی مفاد بالاتر ہونا چاہیئے تو منظر نامہ بڑی حد تک بدل سکتا ہے۔ تاہم اس کے لیے تعلیم و تربیت کے ایسے جامع اور دیرپا نظام کی ضرورت ہے جس کا مخاطب عالمی معاشرے کا ہر فرد بھی ہو اور حکومتیں بھی۔

مجھے امید ہے کہ انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اور انٹرنیشنل کمیٹی آف ریڈ کراس پاکستان نے دو روزہ قومی کانفرنس کے انعقاد اور اس کے بعد اس موضوع پر اس کتابچے کی تیاری کے ذریعے جو سلسلہ شروع کیا ہے، وہ دوررس اور مفید نتائج کا حامل ہو گا۔

خالد رحمٰن
ایگزیکٹو پریزیڈنٹ
انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

باب ۱

ریڈ کراس اور ہلالِ احمر

کا آغاز وارتقاء*

اختلاف انسانی زندگی کا ایک خاصہ ہے، جس کا اظہار کبھی تو صرف چہرے پر ایک لمحے کے لیے ظاہر ہونے والی ناگواری سے ہوتا ہے اور کبھی یہ نسلیں نگل جاتا ہے۔ انسانوں نے جہاں اختلافات کی بنیاد پر طویل اور ہلاکت خیز جنگیں لڑی ہیں، وہیں ہر معاشرے اور ہر دور میں اختلافات کو دور کرنے یا ان کے اثرات کو کم کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ اصول بھی موجود رہے ہیں۔ انسانوں کے مابین تعلق کو زیادہ خوش گوار بنانے میں اہم کردار مذاہب کا اور انسانی جبلت میں فطری طور پر رکھے گئے خیر کے پہلو کارہا ہے۔ آج بھی مختلف تہذیبوں کے وضع کردہ اصول کلّی یا جزوی طور پر ہمارے سامنے موجود ہیں جن میں ایک نوعیت کا تسلسل اور اتفاق بھی نظر آتا ہے۔ انسانی معاشروں میں رائج یہی اصول اور رجحانات بتدریج قوانین کی شکل اختیار کرتے چلے گئے۔

جن قوانین کا تعلق قوموں کے مابین امور اور تعلقات سے ہے، ان میں جنگ سے متعلق قوانین اہم یا شاید اہم ترین ہیں۔ دنیا کے موجودہ بندوبست میں جنگ سے متعلق ان قوانین کو

---

* یہ باب ڈاکٹر محمد مشتاق احمد، ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے اس مقالے پر مبنی ہے جو انہوں نے 'اسلام اور اصول تکریمِ انسانیت' کے موضوع پر انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز اور آئی سی آر سی کے اشتراک سے ہونے والی دوروزہ کانفرنس میں پیش کیا۔

بین الاقوامی قانون برائے تکریمِ انسانیت (International Humanitarian Law) کہا جاتا ہے۔ اس نام سے ہی ان قوانین کا یہ ہدف ظاہر ہے کہ جنگی حالات میں بھی انسانیت کی تکریم اور احترام کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔

بین الاقوامی قانون برائے تکریمِ انسانیت کی موجودہ تاریخ صرف ڈیڑھ سو سال پر مشتمل ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جس بین الاقوامی قانونی نظام میں یہ قانون بنا ہے اس کی اپنی تاریخ بہت مختصر ہے۔ قومی ریاستوں پر مبنی موجودہ عالمی نظام بذاتِ خود ۱۶۴۸ء کے ویسٹ فیلیا معاہدے (Treaty of Westphalia) کے نتیجے میں وجود میں آیا،[1] جس نے مقدس رومی سلطنت (Holy Roman Empire) کے خاتمے کا اعلان کیا اور یورپ میں الگ الگ ریاستوں کا وجود تسلیم کیا گیا۔ ۱۵۶۸ میں شروع ہونے والی اسّی سالہ جنگ سمیت یورپ کے مختلف حصوں میں جاری رہنے والی جنگوں کے پس منظر میں اور ویسٹ فیلیا معاہدے کے بعد قائم شدہ قومی ریاستوں کی باہم چپقلش کے دوران جو قانون وجود میں آیا، وہ آغاز میں تو مسیحی دنیا کی یورپی ریاستوں تک ہی محدود تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کا دائرۂ اطلاق بڑھا اور ۱۹۲۰ء میں لیگ آف نیشنز کے قیام سے اسے موجودہ دنیا کے بین الاقوامی قانون کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

ریڈ کراس کی تنظیم کا قیام بھی یورپی ریاستوں کی اسی چپقلش کے دوران عمل میں آیا۔ ۱۸۵۴ء میں فرانس اور آسٹریا کے درمیان سالفرینو کے مقام پر ایک خونریز جنگ ہوئی

[1] ویسٹ فیلیا کا معاہدہ دراصل ان تین امن معاہدات کا مجموعہ ہے جس کا مقصد ۱۶۱۸ سے ۱۶۴۸ تک جاری رہنے والی 'تیس سالہ جنگ' کو ختم کرنا تھا۔ اندازہ ہے کہ سیاسی اور مذہبی بالادستی کی اس جنگ میں آسٹریا، سپین، فرانس، جرمنی، اور سویڈن میں جنگ، بیماریوں اور بھوک سے ہلاک ہونے والے افراد کی تعداد پچاس سے اسّی لاکھ تک تھی۔

جس میں ان دونوں ممالک کے اتحادیوں نے بھی حصہ لیا۔ اس جنگ میں بڑی تعداد میں ہلاک اور زخمی ہونے والوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا—نہ ہی زخمیوں کے لیے کوئی امداد تھی اور نہ لاشوں کو ٹھکانے لگانے کا کوئی انتظام۔ ایسے میں سوئٹزرلینڈ سے تعلق رکھنے والے ایک تاجر ہنری ڈُونا (Henry Dunant) کا وہاں سے گزر ہوا۔ یہ ایک نرم دل مسیحی تھا۔ جنگ کی تباہ کاریوں نے اس کے دل پر بہت اثر کیا اور اس نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل ایک چھوٹی سی کتاب (A Memory of Solferino) مرتب کی، جو ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں ہنری ڈونا نے دو اہم تجاویز پیش کیں۔ پہلی تجویز یہ تھی کہ ایک غیر جانبدار تنظیم ہونی چاہیے جو صرف انسانی ہمدردی کی بنیاد پر زخمیوں کو بلا تفریق طبّی امداد پہنچائے اور لاشوں کو احترام سے ٹھکانے لگائے۔ اس اصولی اور بنیادی تجویز کو عملی شکل دینے کے لیے اس کتاب میں پیش کی گئی دوسری تجویز دراصل بہت اہم ثابت ہوئی اور وہ یہ کہ ایسی تنظیم کے کام میں سہولت کے لیے ضروری ہے کہ ریاستیں باہم ایک معاہدہ کریں اور اس تنظیم کو یہ کام کرنے کا موقع بھی فراہم کریں اور اختیار بھی دیں۔

ہنری ڈُونا نے ان تجاویز پر حمایت حاصل کرنے کے لیے متعدد سفر کیے، یہاں تک کہ جنیوا کی عوامی فلاحی انجمن کے صدر گستاو مونیے (Gustave Moynier) نے فروری ۱۸۶۳ء میں تنظیم کا ایک اجلاس خاص انہی تجاویز اور کتاب کے لیے مختص کر دیا۔ اس اجلاس میں یہ جائزہ لینے کے لیے کہ کیا یہ تجاویز قابلِ عمل ہیں، سوئٹزرلینڈ کے پانچ افراد پر مشتمل ایک کمیٹی (Committee of Five) تشکیل دی گئی جس میں خود ہنری ڈُونا اور معروف قانون دان گستاو مونیے کے علاوہ ایک معروف فوجی جنرل اور دو سرجن شامل تھے۔ جلد ہی اس کمیٹی کا نام زخمیوں کی امداد کے لیے بین الاقوامی کمیٹی

(International Committee for Relief of the Wounded) رکھ دیا گیا۔ ۱۸۶۴ء میں، یعنی اس کمیٹی کے قیام کے اگلے سال، یورپی طاقتوں نے آپس میں پہلا جنیوا معاہدہ کیا، جس میں یہ اقرار کیا گیا کہ جنگی زخمیوں کی دیکھ بھال کی جائے گی چاہے وہ کسی بھی فریق سے تعلق رکھتے ہوں، اور نو تشکیل شدہ کمیٹی کو غیر جانب دار رہتے ہوئے یہ خدمت انجام دینے کا اختیار (Mandate) دے دیا گیا۔ بعد ازاں ۱۸۷۶ء میں اس تنظیم کا نام انٹرنیشنل کمیٹی آف دی ریڈ کراس (International Committee of the Red Cross – ICRC) کر دیا گیا۔

وقت کے ساتھ ساتھ کمیٹی کا کام جنگی زخمیوں کی دیکھ بھال تک محدود نہ رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد بالخصوص جنگی قیدیوں کے متعلق معاہدہ اور بعد ازاں دوسری جنگ عظیم کے بعد جنگی امور سے متعلق مزید معاہدات ہوئے جن کو مجموعی طور پر ۱۹۴۹ء کے جنیوا معاہدات (Geneva Conventions) کہا جاتا ہے۔[2] اس پھیلاؤ کے ساتھ یہ

---

[2] پہلا جنیوا معاہدہ جنگ کے دوران زخمیوں کی نگہداشت کا معاہدہ ۱۸۶۴ کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس معاہدے کو تین سال کے اندر ہی تمام اہم یورپی طاقتوں اور سلطنتِ عثمانیہ سمیت کئی دیگر ریاستوں کی توثیق حاصل ہو گئی۔ ۱۹۰۶ء میں ہونے والے دوسرے جنیوا معاہدے نے اولین معاہدے میں ترمیم اور توسیع کی، ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء میں ہونے والے ہیگ کنونشنز نے ان اصولوں کا اطلاق بحری جنگ پر بھی کیا۔ جنگی قیدیوں کے ساتھ سلوک سے متعلق تیسرا جنیوا معاہدہ ۱۹۲۹ء میں طے پایا۔ ۱۹۴۸ء میں سٹاک ہوم میں ہونے والی انٹرنیشنل ریڈ کراس کانفرنس نے ان تمام معاہدات اور اصولوں کو زیادہ جامعیت کے ساتھ چار معاہدات میں سمو دیا، جن کی توثیق ۱۲ اگست ۱۹۴۹ء کو کی گئی۔ یہ چار معاہدات یہ ہیں: میدانِ جنگ میں مسلح افواج کے زخمیوں اور بیماروں کی نگہداشت کا معاہدہ؛ سمندر میں مسلح افواج کے زخمی، بیمار اور تباہ شدہ جہاز کے ارکان کی نگہداشت کا معاہدہ؛ جنگی قیدیوں سے سلوک سے متعلق معاہدہ؛ اور جنگ کے دوران غیر فوجی افراد کے تحفظ سے متعلق معاہدہ۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد آزادی اور اقتدار کی جنگوں کے تناظر میں جنگ سے متعلق بین الاقوامی قانون میں توسیع کی ضرورت محسوس ہوئی اور ۱۹۷۷ء میں

ضرورت بھی محسوس ہوئی کہ مسیحیت سے ہٹ کر مسلم پس منظر کے علاقوں کے لیے اس تنظیم کو ایک الگ شناخت بھی دی جائے۔ اس طرح سلطنتِ عثمانیہ کے زیرِ انتظام علاقوں میں ہلالِ احمر کا قیام عمل میں آیا (اس حوالے سے کچھ تفصیل ذیل میں بیان کی گئی ہے)۔ قوانینِ جنگ کے ساتھ ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کی ذمہ داریوں اور دائرۂ عمل میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ شروع میں اس کے دائرۂ عمل میں جنگ سے پیدا ہونے والے مسائل کو شامل کیا گیا اور رفتہ رفتہ قدرتی آفات کی صورت میں بھی اس کا کردار بڑھتا چلا گیا۔ اب انسانی ہمدردی اور خدمت پر مبنی کئی طرح کی سرگرمیاں اس کمیٹی کے تحت عمل میں لائی جاتی ہیں۔

جنگ، وسیع پیمانے پر تشدد اور قدرتی آفات سے نمٹنے کے لیے ہر ملک میں قومی ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کمیٹیاں وجود میں لائی گئیں۔ ان قومی کمیٹیوں کے باہم رابطے اور اشتراک کے لیے ایک وفاق بھی تشکیل دیا گیا ہے جسے ریڈ کراس اور ہلالِ احمر انجمنوں کی فیڈریشن (International Federation of Red Cross and Red Crescent Societies – IFRC) کہا جاتا ہے۔ گویا ریڈ کراس موومنٹ کے تین عناصر ہیں: جنگ سے متعلق امور سے نمٹنے کیلئے بین الاقوامی ریڈ کراس کمیٹی؛ قدرتی آفات سے نمٹنے کے لیے ہر ملک کی قومی کمیٹی یا انجمن؛ اور ان انجمنوں کے باہم ارتباط و تعاون کے

ریڈ کراس کی کوششوں سے جنیوا معاہدات کے ساتھ دو اضافی پروٹوکول منظور کیے گئے۔ ان میں پہلا اضافی پروٹوکول حقِ خود ارادیت کی مسلح جدوجہد پر جنگی اصولوں کے اطلاق سے متعلق ہے، جب کہ دوسرے اضافی پروٹوکول نے شدید خانہ جنگی کے حالات میں انسانی حقوق کی پاسداری کا نظام ترتیب دیا؛ تیسرا اضافی پروٹوکول جس میں تحریک کے لیے ایک نئے نشان (emblem) کی منظوری دی گئی، اس کا ذکر آئندہ آرہا ہے۔ دُنیا کے تقریباً تمام ممالک (۱۹۶) نے جنیوا کنونشنز کی توثیق کی ہے جبکہ اضافی پروٹوکولز کے دستخط اور توثیق کنندگان کی تعداد میں بھی بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔

لیے بین الاقوامی فیڈریشن۔ اسی نظام کے تحت پاکستان میں جہاں بین الاقوامی ریڈ کراس کمیٹی موجود ہے وہاں قومی سطح پر انجمن ہلال احمر بھی قائم ہے جو بین الاقوامی فیڈریشن کی رُکن ہے۔ جنیوا کنونشنز کے رکن ممالک اور یہ قومی انجمنیں بین الاقوامی ریڈ کراس کمیٹی کی آمدن کے اہم ذرائع بھی ہیں، تاہم کثیر القومی تنظیمیں جیسے یورپی یونین اور دیگر ذرائع بھی رضاکارانہ بنیاد پر اس سلسلے میں تعاون کرتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس تنظیم کو بنیادی طور پر مسیحی اخلاقیات پر استوار کیا گیا تھا اور خود ہنری ڈُونا کی کتاب یہ نشان دہی کرتی ہے کہ اس سوچ کے لیے نہ صرف بنیادی محرک مسیحی تصوّرِ اخلاق سے آیا بلکہ اس کا عملی اظہار بھی انہی اخلاقیات پر مبنی ہے جو مسیحی مذہب میں موجود ہیں۔ ریڈ کراس کی داغ بیل ڈالنے سے پہلے ہنری ڈُونا نے مسیحی نوجوانوں کی تنظیموں کا بین الاقوامی اتحاد تشکیل دیا تھا اور اس وقت بھی جب اس کا گزر سالفرینو سے ہوا تو وہ نپولین ثالث سے کچھ تجارتی امور کی اجازت لینے کے علاوہ اس مقصد سے بھی ملنے جا رہا تھا کہ وہ نپولین ثالث کو مقدس رومی سلطنت کے احیا کی تجویز پر مشتمل اپنی تجاویز پیش کر سکے۔ اگرچہ ڈُونا کا بین الاقوامیت کا شعور اسے یہ بتاتا تھا کہ ایثار (Charity) سے متعلق مسیحی تعلیمات ایسی ہیں جو سرحدوں سے بالاتر اور دنیا بھر میں قابلِ نفاذ ہیں، تاہم ابتدائی طور پر ڈُونا نے جس ریڈ کراس کا تصور کیا تھا وہ بالکل ہی ایک لادینی تحریک نہ تھی بلکہ زخمیوں، مریضوں اور بے کسوں کی کفالت کا ایک ایسا بین الاقوامی ادارہ تھا جس کا خمیر ایثار کی مسیحی روایات پر اٹھایا گیا تھا۔ اگرچہ خود ڈُونا کے الفاظ میں اس کا فائدہ 'فرانسیسیوں، عربوں، جرمنوں اور سلاویوں' سب کے لیے یکساں تھا۔ ایثار کی ان مسیحی تعلیمات کا نچوڑ یہ

ہے کہ انسان دوسروں کو راحت پہنچانے کے لیے مشکلات اور تکالیف خود اپنی جان پر سہہ لے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اسی مذہبی بنیاد نے اس تصور کو یورپی ریاستوں کے درمیان قابل قبول بنانے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

یہ ایک دلچسپ امر ہے کہ ایک بین الاقوامی انسانی تحریک کے طور پر ریڈ کراس کی ابتدائی تشکیل میں اہم ترین کردار ہنری ڈُونا کا نہیں بلکہ گُستاو موینے کا تھا جو بالکل آغاز سے ہی ڈونا کی مشاورت اور کوششوں کا حصہ رہا تھا۔ وہ نہ صرف پانچ افراد کی کمیٹی کا چیئر مین تھا بلکہ بعد ازاں ۱۸۶۴ء سے ۱۹۱۰ء میں اپنی وفات تک کمیٹی کا چیئر مین بھی رہا۔ اس عرصے میں موینے نے اس کمیٹی کو غیر یورپی اور غیر مسیحی اقوام تک بھی عام کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ اس کاوش کے پیچھے کارفرما بنیادی تصور ایسا ہے کہ غیر یورپی طاقتیں بھی اس میں شامل ہو سکتی ہیں۔ اس سوچ کے تحت کمیٹی کو مسیحی اصطلاحات اور اصولوں سے آزاد کر کے غیر مذہبی بنیادوں پر پیش کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ اس تحریک کو انسانیت کے مشترکہ ورثے کے طور پر پیش کیا جائے۔

کمیٹی کی تشکیل کے وقت اور اس کے بعد ابتدائی عرصے میں تو یورپی اقوام باہم ایک دوسرے کے ساتھ برسرِ پیکار تھیں۔ تاہم اس وقت بھی جب کوئی مسلم ریاست جدید جنگی قوانین کی تیاری اور ریڈ کراس کی جانب پیش رفت کا حصہ نہیں تھی، اس قانون پر مسلم اثرات اس لیے مرتب ہو رہے تھے کہ صلیبی جنگوں کے پس منظر کے ساتھ یہ نئی ترتیب مسلمانوں کے مقابل تشکیل پا رہی تھی۔ جنیوا میں منعقد ہونے والی ۱۸۶۳ء کی کانفرنس میں، جس نے ریڈ کراس کی کمیٹی کو جنم دیا، کوئی مسلم ریاست موجود نہ تھی۔ تاہم ترکی نے ۱۸۶۴ء کے معاہدے کی توثیق ۱۸۶۵ء ہی میں کر دی اور اس کی روشنی میں سلطان یعنی خلیفہ

نے یہ احکام بھی جاری کیے کہ اس کمیٹی کو بیان کردہ کام کرنے دیا جائے گا اور اس کے اہلکاروں اور املاک پر حملہ نہیں کیا جائے گا۔

جب عثمانی خلافت کے ساتھ تعامل شروع ہوا تو ان اصولوں کو مسیحیت سے الگ کرنے کی ضرورت زیادہ محسوس ہوئی۔ ۱۸۶۸ء میں ترکی نے جنیوا معاہدے پر نظر ثانی کے لیے منعقدہ کانفرنس میں اور پھر سینٹ پیٹرز برگ کانفرنس میں شرکت کی۔ ۱۸۷۴ء میں ایران نے بھی جنیوا معاہدے کی توثیق کر دی۔ تاہم ان تمام مجالس میں مسلمانوں کا کردار اس لیے بھی محدود تھا کہ اس تحریک کی تدوین و ترتیب یورپ کے جدید ریاستی نظام پر استوار تھی جب کہ سلطنتِ عثمانیہ ایک ایسی روایتی مسلم ریاست تھی جو مختلف ایسی قومی اکائیوں پر مشتمل تھی جن کو دینِ اسلام کی یکسانیت نے ایک مرکز پر یکجا کیا ہوا تھا۔ ترکی اور ایران کی جانب سے بھی کمیٹی کے نشان سے متعلق اعتراض مسلسل موجود تھا کہ سرخ صلیب دراصل مسیحیت کی علامت ہے۔

اسی دوران ۱۸۷۴ء میں بلقان کی جنگ شروع ہوئی جس میں مسلمان اور مسیحی آمنے سامنے تھے۔ اس جنگ میں مسیحی اقوام بھی صلیب کا نشان بلند کر رہی تھیں اور اس اصولی طور پر غیر جانبدار کمیٹی کا نشان بھی صلیب پر مشتمل تھا۔ اس پس منظر میں مسلمانوں کی جانب سے اعتراض کی واضح وجوہات اور اس کی صدیوں پر محیط تاریخی بنیادیں بھی موجود تھیں۔ اس وقت باوجود اس کے کہ اس کمیٹی کے حق میں سلطان کے فرامین بھی موجود تھے، اس جنگ میں ریڈ کراس کے اہلکاروں کو بار بار نشانہ بنایا گیا اور دیگر متعلقہ مسائل بھی بار بار بہت شدت سے سامنے آئے۔

مسیحیوں اور مسلمانوں کے درمیان اس خلیج کو پاٹنے میں گستاو مونیے کی کاوشوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ مونیے نے اس تحریک کی مسیحی بنیادوں سے انکار نہیں کیا لیکن اس کا اصرار تھا کہ اسے عالمی قبولیت صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب یہ کسی خاص مذہب سے منسوب نہ ہو۔ اس کا کہنا تھا کہ بین الاقوامی قانونِ جنگ اجتماعی انسانی ضمیر، مشترکہ اخلاقی اقدار اور بین الاقوامی یکجہتی کا اظہار ہے۔ اس نے ۱۸۶۸ء میں عثمانی ہلالِ احمر سوسائٹی کے قیام میں مرکزی کردار ادا کیا۔ ریڈ کراس کے نشان کو غیر مذہبی علامت تسلیم کر لیے جانے کے بعد بھی جو عملی مشکلات پیش آ رہی تھیں، ان کے تناظر میں فوری حل یہی نظر آتا تھا کہ اسلامی پس منظر رکھنے والے ایک مزید امتیازی نشان ہلالِ احمر کو تسلیم کر لیا جائے۔ اس تجویز کی حمایت کرتے ہوئے گستاو مونیے نے ۱۸۷۷ء میں اس خواہش کا اظہار کیا کہ ''وہ قواعدِ انسانیت رُو بعمل لائے جائیں جن کی طرف کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والے تمام انسانوں کے دل کھنچے چلے آتے ہیں۔ یہ مناسب نہیں ہے کہ کوئی بھی ایسا مسئلہ جس کا تعلق محض ظاہر سے ہو، ان اصولوں کے غیر مسیحی اقوام میں پھیلنے کی راہ میں رکاوٹ بن جائے بلکہ غیر مسیحی اقوام کی وجہ سے خود ریڈ کراس کو بدلنا بھی قابلِ قبول ہے۔''

کچھ رسمی خط و کتابت کے بعد کمیٹی نے ترکی کو یہ اجازت دے دی کہ وہ ریڈ کراس کی جگہ ہلالِ احمر استعمال کر سکے۔ بعد ازاں ایران نے سرخ سورج اور شیر کے نشان کا مطالبہ کیا اور ۱۹۲۳ء میں یہ مطالبہ مان لیا گیا۔ باوجود اس کے کہ ہلالِ احمر کو بھی ایک رسمی حیثیت حاصل ہے، سرخ صلیب کا نشان مسلمانوں کے لیے ابتدا سے اب تک ایک سوال کی حیثیت رکھتا ہے۔ بنیادی طور پر اس لیے کہ یہ نشان اس تحریک کے مسیحی پس منظر اور بنیادوں کا عکاس ہے۔

اس تحریک کے لیے ریڈ کراس کا نشان کیوں اپنایا گیا؟ اس سوال کا ایک جواب تو اس تاریخی پس منظر میں ہے جس میں مسیحی اقوام کی باہم چپقلش کے دوران اس تحریک کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ نیز یہ کہ خود ہنری ڈُونا ایک باعمل مسیحی تھا۔ اس نشان کی ایک تعبیر ۱۹۰۶ء کی کانفرنس میں یہ کی گئی کہ اس نشان میں سوئٹزرلینڈ کے پرچم کو معکوس کیا گیا ہے، جس کی شناخت ایک غیر جانبدار ریاست کی رہی ہے۔ سوئٹزرلینڈ کے پرچم میں پس منظر سرخ ہے جب کہ اس پر بنا ہوا صلیب کا نشان سفید رنگ کا ہے۔ اس کے برعکس اس تحریک کے نشان میں پس منظر سفید اور صلیب کا نشان سرخ ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہلالِ احمر کے پرچم میں ترکی کے پرچم کو معکوس کیا گیا ہے۔

۱۸۶۴ء کے جنیوا معاہدے کے تسلسل میں ہونے والی ۱۸۹۹ء اور ۱۹۰۷ء کی ہیگ امن کانفرنسوں میں ترکی اور ایران کے وفود نے الگ الگ شرکت کی۔ اگرچہ یہ وفود مسلم آبادی کی نمائندگی کر رہے تھے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انفرادی سطح پر یہ وفود اسلام کے نمائندہ نہ تھے۔ نیز بدلتی ہوئی عالمی ترتیب میں ان کی آواز کچھ زیادہ مؤثر بھی نہ رہی تھی۔ بہرحال ان وفود کی مداخلت کے نتیجے میں ہیگ کانفرنسوں نے مذہبی لاتعلقی (Secularism) کو بین الاقوامی قانونِ انسانیت کے مرکزی عقیدے کے طور پر قبول کر لیا۔ بعد کے سالوں میں اسلامی ریاستوں کی تعداد بڑھنے سے اس نظام کی تشکیل میں اسلامی شناخت کو نسبتاً نمایاں مقام ملا۔ ۱۹۲۹ء کے جنیوا معاہدے کے ذریعے ہلالِ احمر اور Red Lion & Sun کے نشانات کو رسماً تسلیم کر لیا گیا۔

ارتقا کے اسی عمل میں دوسری جنگِ عظیم کے بعد شعوری طور پر کوشش کی گئی کہ اس تحریک کو مسیحی اصولوں سے آزاد کر کے انسانیت کے مشترکہ ورثے کے طور پر پیش کیا

جائے اور تکریمِ انسانیت کے سات اصولوں کو ہر معاشرے، ثقافت اور مذہب کی سطح پر پیش کیا جائے۔

دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے مسلم ریاستوں کی تعداد میں اضافہ ہوا جس سے عالمی سطح پر ان کی نمائندگی میں اضافہ ہوا۔ تاہم ان کی یہ شرکت اسلام کی بجائے وطنیت کی بنیاد پر تھی۔ اس عرصے میں متعدد ایسے تنازعات پیش آئے جن میں مسلم ممالک کو فریق کی حیثیت حاصل تھی۔ اس تناظر میں مسلم ممالک نے آزادی کی تحریکوں پر بین الاقوامی قانونِ انسانیت کے اطلاق سمیت متعدد ایسے امور میں نمایاں حصہ لیا، جن سے بین الاقوامی قانون برائے تکریمِ انسانیت کی تعمیر و تشکیل میں پیش رفت ہوئی۔

۱۹۷۰ء کی دہائی میں مسلم فکر میں ایک تبدیلی دیکھنے میں آئی اور بعض افراد و طبقات نے اسلامی قانون کو بین الاقوامی قانونِ انسانیت کے متبادل کے طور پر پیش کرنا شروع کیا۔ ۱۹۷۹ء میں ایران میں آنے والے انقلاب کے بعد ایک اور رجحان سامنے آیا جس کے تحت اسلام اور بین الاقوامی قانونِ انسانیت کو باہم مقابل نظام ہائے قانون کے طور پر پیش کیا جانے لگا۔ ایران کی طرف سے مسلکی امتیاز کی بجائے اسلامی تشخص کو اپنانے کا میلان اس وقت واضح طور پر نظر آیا جب ستمبر ۱۹۸۰ء میں ایران نے Red Lion & Sun کے نشان کو ترک کر کے ہلالِ احمر کے امتیازی نشان کو اپنا لیا۔ ۱۹۸۰ء ہی میں ایران اور عراق کے درمیان شروع ہونے والے تصادم میں ایران نے مسلم اقوام کے سامنے یہ سوال پیش کیا کہ جنگ میں ان کے عمل کا محرک بین الاقوامی قانونِ انسانیت ہے یا اسلام؟ گویا اب دونوں نظام ہائے قوانین کو ایک دوسرے سے نبرد آزما سمجھا جانے لگا تھا۔ بعد کے عرصے میں دنیا کے مختلف حصوں میں سامنے آنے والی غیر ریاستی قوتوں مثلاً القاعدہ نے واضح طور پر

بین الاقوامی قانون کو ماننے اور اس کی پیروی سے انکار کر دیا۔ تاہم ان رجحانات نے اس موقف کو مزید تقویت ہی دی کہ تکریمِ انسانیت کی ایک عالمی تحریک کو مذہب سمیت تمام امتیازات سے بالاتر ہونا چاہیے۔ اسی تسلسل میں ۲۰۰۵ء میں طے پانے والا تیسرا اضافی پروٹوکول بین الاقوامی قوانینِ جنگ کا حصہ بنایا گیا۔ اس پروٹوکول کے ذریعے چار کونوں پر مشتمل ایک غیر مذہبی اور غیر جانبدار نشان کو بھی تسلیم کیا گیا، جو ریڈ کرسٹل کہلاتا ہے۔

تاہم مذہبی بنیاد سے دور ہونے کی یہ کوشش مسلمانوں کے لیے ایک اور سوال پیدا کرتی ہے کیوں کہ مسیحیت یا کسی بھی دیگر مذہب کے ساتھ تو اسلام کے مشترکات متعدد ہو سکتے ہیں لیکن ایک قطعی غیر مذہبی بنیاد پر قائم تحریک اور اسلامی نقطۂ نظر میں مشترکات تلاش کرنا مشکل ہو گا۔ یہ بہر حال ایک حقیقت ہے کہ اس کمیٹی کا وجود اسلامی قانون کی بنیاد پر نہیں ہے اور اس کی تشکیل وارتقاء میں اسلامی ممالک کا کوئی نمایاں حصہ نہیں ہے۔ اسی طرح قوانینِ جنگ میں اسلامی قانون نہ تو کارفرما ہے اور نہ ہی اسے ایک ذریعے (Source) کی حیثیت حاصل ہے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ ۱۹۷۷ء کے دونوں اضافی پروٹوکولز کی تشکیل میں مسلم اقوام کا اہم کردار رہا ہے اگرچہ مسلم ممالک کا یہ کردار بطور اسلامی ریاستوں کے نہیں بلکہ غیر مذہبی قومی ریاستوں کی صورت میں تھا۔ اسی طرح مختلف بین الاقوامی امور میں فیصلہ کرتے ہوئے اسلامی قانون سے استفادہ ضرور کیا گیا۔ اسی تسلسل میں جنیوا میں اسلامی قانون پر مسلسل غور وفکر اور تحقیق جاری ہے۔ گویا ریڈ کراس کی بین الاقوامی تحریک کو مسیحی اخلاقیات کی نسبت عالمی انسانی اخلاقیات کے قریب تر کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جنہیں ہر معاشرہ خود سے قریب تر سمجھے۔ تکریمِ انسانیت کے یہ سات اصول دراصل اسی فکر کے مظہر ہیں۔

باب ۲

بنیادی اصول کی اہمیت اور ضرورت

تصور کریں کہ آپ ریڈ کراس یا ہلالِ احمر سے وابستہ ایک رضاکار ہیں اور آپ کے ملک میں خونریز خانہ جنگی جاری ہے۔ آپ بلا تفریق بیماروں اور زخمیوں تک طبّی امداد پہنچانا چاہتے ہیں لیکن ان مریضوں کو ہسپتال منتقل کرنے کے لیے آپ کو حکومت اور باغیوں کی قائم کردہ متعدد چوکیوں سے گزرنا ہوگا۔ پہلی ہی چوکی پر تعینات فوجی یہ جاننے پر مصر ہے کہ ایمبولینس میں کون ہے اور یہ جاننے پر کہ مریض یا زخمی کا تعلق مخالف گروہ سے ہے، وہ نہ صرف راستہ دینے سے انکار کر دیتا ہے بلکہ آپ پر بھی دشمن کی امداد کا الزام لگا دیتا ہے۔ ایسے میں آپ کیا کریں گے؟ آپ اسے کیسے یقین دلائیں گے کہ آپ کا کام جنگ سے متاثرہ ہر فرد کی مدد کرنا ہے، چاہے اس کا تعلق کسی بھی فریق سے ہو؟

اب ایک دوسری صورتِ حال کا تصور کیجیے۔ ایک تباہ کن سیلاب کے دوران آپ بچ جانے والے افراد تک خوراک پہنچانے والی ٹیم کے سربراہ ہیں۔ مقامی سیاست دان اور میڈیا آپ کی ایسی کارکردگی فوراً دیکھنا چاہتے ہیں جسے وہ عوام کے سامنے پیش کر سکیں۔ وہ بار بار آپ کو یہ بتانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ ان کے خیال میں آپ کی فوری مدد کا مستحق سب سے پہلے کون ہے۔ ایسے میں آپ کس کی مدد کو سب سے پہلے دوڑیں گے؟ اور آپ کے اس فیصلے کی بنیاد کیا ہوگی؟

یہ اور اس قسم کے مشکل فیصلے دنیا بھر میں موجود ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کے رضاکاروں کے لیے ایک معمول ہیں۔ خوش قسمتی سے ان اداروں نے ایسے حالات سے نمٹنے کے وسائل پیدا کر لیے ہیں۔ ان میں سب سے اہم وسیلہ سات بنیادی اصول ہیں جو **انسانیت، غیر وابستگی، غیر جانبداری، خود مختاری، رضاکارانہ خدمت، اتحاد اور عالمگیریت** ہیں۔ یہ اصول خود ایک منزل بھی ہیں اور راستہ بھی، اور یہ امن، جنگ اور سانحات میں یکساں اہم ہیں۔ سیاسی وابستگی، نسل یا مذہب سے بے نیاز ہو کر ہر ضرورت مند کی مدد کرنا ان اصولوں کی اصل روح اور ہدف ہے اور انہی کی بنیاد پر ہر طرح کے حالات میں لوگ ان رضاکاروں پر اعتماد بھی کرتے ہیں۔ یہ اصول ان اقدار و اہداف کا احاطہ بھی کرتے ہیں جن پر انسانیت کی یہ عالمگیر تحریک یکجا ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ اصول اس تحریک کے رضاکاروں اور ملازمین کے لیے دعوتِ عمل ہیں کہ وہ بلا امتیاز انسانی مصائب کے سدّباب اور انہیں دور کرنے کی کوشش کریں۔

اس لیے یہ اہم ہے کہ دنیا بھر میں لوگ ان بنیادی اصولوں سے آگاہ ہوں اور یہ سمجھتے ہوں کہ ریڈ کراس کی بین الاقوامی کمیٹی، ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کی قومی انجمنوں اور ان کی بین الاقوامی فیڈریشن کی سرگرمی کا اصل محرک تکریمِ انسانیت ہے۔ ان اداروں کو اپنے کردار اور عمل سے خود کو اس قابل ثابت کرنا ہوتا ہے کہ کسی بھی تنازع میں شریک ہر ایک بھی مسلح گروہ کو یہ یقین ہو کہ ریڈ کراس اور ہلال احمر کے نمائندے جو اس گروہ کے زیرِ انتظام علاقے میں داخل ہونا چاہتے ہیں، ان کا مقصد محض ضرورت مند افراد کی مدد کرنا ہے۔ اسی طرح دنیا بھر میں جو اہلِ خیر ریڈ کراس کی عالمی تحریک سے وابستہ اپنی قومی

انجمنوں کے لیے وقت اور پیسہ قربان کرتے ہیں، انہیں بھی یہ اعتبار ہونا چاہیے کہ ان کے وسائل شدید ضرورت مند افراد پر ہی صرف ہو رہے ہیں۔

یہ سات بنیادی اصول ایک صدی سے زائد عرصہ پر محیط انسانی خدمت کی پیداوار ہیں اور بین الاقوامی قانون برائے تکریم انسانیت (International Humanitarian Law) میں انہیں اہمیت حاصل ہے۔ جن ممالک نے ۱۹۴۹ء کے جنیوا معاہدات سے اتفاق کیا ہے انہوں نے سرکاری طور پر یہ تسلیم کیا ہے کہ ان کی قومی انجمنیں اپنی سرگرمیوں کو ریڈ کراس کے اصولوں کے مطابق ترتیب دیں گی۔ ۱۹۷۷ء میں دستخط کردہ اضافی معاہدات میں ریاستوں نے یہ بھی ذمہ لیا ہے کہ اس تحریک کے تمام اجزا، یعنی قومی انجمنیں، ریڈ کراس اور ان کی بین الاقوامی انجمن، اپنی سرگرمیوں کو ان اصولوں کے مطابق جاری رکھ سکیں گی۔ یہی وعدہ ۱۹۸۶ء میں جاری کردہ تحریک کے قواعد (Statutes of the International Red Cross and Red Crescent Movement) میں بھی تحریر کیا گیا ہے۔

دراصل ان اصولوں کی تشکیل تحریک کے بالکل ابتدائی دنوں سے ہی ہو گئی تھی۔ گستاو موینے نے اس تحریک کی بنیادوں کو بیان کرنے والے ان اصولوں کے لیے مناسب الفاظ کے چناؤ پر خصوصی توجہ دی۔ ان اصولوں کے حوالے سے ۱۹۲۱ء کو خصوصی اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ اس سال ریڈ کراس کی بین الاقوامی کمیٹی نے چار بنیادی اصولوں کو اختصار سے اپنے قواعد کا حصہ بنایا اور اپنے تمام کاموں میں ان کی بالادستی کے عزم کا اظہار کیا۔ یہ چار اصول غیر وابستگی، سیاسی، مذہبی اور معاشی خود مختاری، عالمگیریت اور قومی انجمنوں کی مساوات تھے۔ اگرچہ ان اصولوں کی تشکیل و تشریح کے لیے مختلف حوالوں

سے پیش رفت جاری رہی لیکن اس حوالے سے اہم کردار ۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۴ء تک ریڈ کراس کے صدر رہنے والے میکس ہُوبر (Max Huber) کا ہے، جنہوں نے انسانیت کو تمام سرگرمیوں کی بنیاد قرار دیا اور غیر جانبداری کو عمل کے میدان میں اہم ترین قرار دیا۔ ۱۹۵۶ء میں جب جین پکٹے (Jean Pictet) نے بنیادی اصولوں کی تشریح لکھی تو اس نے میکس ہُوبر کی سوچ کو خوب سراہا۔ پکٹے کی اس تشریح نے دنیا بھر میں امدادی و فلاحی سرگرمیوں میں مصروف افراد کی توجہ حاصل کی، اور ان پر غور و خوض کے لیے ایک کمیشن قائم کیا گیا۔ مشاورت کے عمل کے نتیجے میں ۱۹۶۰ء میں 'انسانیت' کو بھی بطور اصول اپنانے کی سفارش کی گئی اور اگلے ہی سال اسے بنیادی اصولوں کا حصہ بنا لیا گیا۔ ۱۹۸۶ء میں ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں ریڈ کراس اور ہلالِ احمر تحریک کے لیے ان سات اصولوں کی منظوری دی گئی، جن سے آج ہم آگاہ ہیں۔[1]

مذکورہ اصول ریڈ کراس اور ہلالِ احمر تحریک تک ہی محدود نہیں ہیں بلکہ طویل عرصے تک مؤثر رہنے کی بناء پر بہت سی تحریکوں نے انہیں مکمل طور پر یا ان میں سے کچھ کو اپنا لیا ہے۔ دسمبر ۱۹۹۱ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک قرارداد منظور کی جو یہ مطالبہ کرتی ہے کہ تکریمِ انسانیت کی تمام تر سرگرمیوں میں انسانیت، غیر جانبداری اور غیر وابستگی کے اصولوں کی بنیاد پر معاونت فراہم کی جائے۔ انسانیت، غیر وابستگی اور خود مختاری ریڈ کراس اور ہلال احمر کی عالمی تحریک اور مصائب میں امداد کی غیر سرکاری تنظیموں کے

[1] ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کی بین الاقوامی تحریک ہر چار سال بعد ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کرتی ہے، جس میں دنیا کے تقریباً تمام ممالک کی ریڈ کراس اور ریڈ کریسنٹ انجمنوں کے نمائندے شریک ہو کر تحریک کے پچھلے چار سال کی کارکردگی کا جائزہ لے کر آئندہ چار سال کے لیے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔ اس نوعیت کی پہلی کانفرنس ۱۸۶۷ء میں پیرس میں منعقد ہوئی تھی۔

قواعد کار میں شامل ہیں اور پانچ سو سے زائد غیر سرکاری تنظیمیں ایسی ہیں جنہوں نے انہیں اپنا رکھا ہے۔ اگرچہ کچھ تنظیمیں ان اصولوں کی تشریح اور تنفیذ مختلف انداز میں کرتی ہیں، تاہم حقیقت یہی ہے کہ ان بنیادی اصولوں نے صرف ریڈ کراس اور ہلال احمر کو ہی نہیں بلکہ تکریمِ انسانیت کے شعبے کو بالعموم متاثر کیا ہے۔

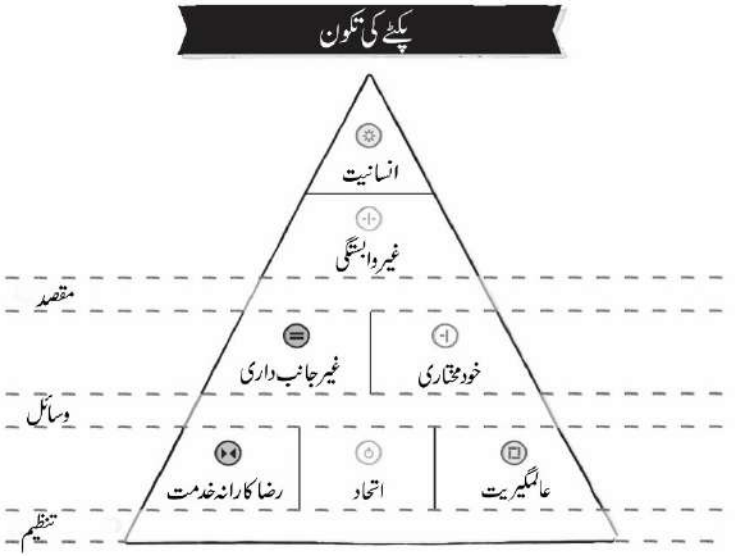

بنیادی اصول کی تشکیل میں جین پکٹے (Jean Pictet) کا کردار بہت اہم ہے اور ۱۹۷۹ء میں ان کی تحریر کردہ تشریح اب بھی ان اصولوں کی وضاحت کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ انہوں نے ان اصولوں کو ایک اہرامی شکل میں مرتب کیا جو یہ وضاحت کرتا ہے کہ انسانیت دیگر ہر اصول پر مقدم ہے۔ انسانیت اور غیر جانبداری بقیہ اصولوں کی تشکیل کرتے ہیں۔

اگرچہ جنیوا معاہدات کی رُو سے ریڈ کراس تحریک کو جنگی حالات میں امدادی کارروائیاں انجام دینے کا حق اور اختیار حاصل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ جنگ کے انتہائی

تناؤ والے ماحول میں یہ کبھی بھی آسان نہیں رہا۔ اس کے علاوہ حالیہ عرصے میں جنگ کے انداز میں جو تبدیلیاں رُونما ہوئی ہیں، ان کے نتیجے میں ریڈ کراس اور ہلالِ احمر تحریک کی سرگرمیوں کو مزید مشکلات کا سامنا ہے۔

اصولِ جنگ اور بدلتے رجحانات

بین الاقوامی قانون برائے تکریمِ انسانیت انسانی ہمدردی میں کام کرنے والی تنظیموں کو جنگ زدہ علاقوں میں بلا روک ٹوک چلے جانے کی ضمانت فراہم نہیں کرتا بلکہ ان تنظیموں کو جنگ کے فریقین سے مذاکرات کے نتیجے میں ہی متاثرہ افراد تک رسائی ملتی ہے۔ اپنے زیرِ انتظام علاقوں میں موجود افراد کی بنیادی ضروریات کا اہتمام اصولی طور پر محارب گروہوں ہی کی ذمہ داری ہے، تاہم اگر وہ ایسا نہ کر رہے ہوں یا نہ کر پا رہے ہوں تو قانون ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ انسانی بنیادوں پر غیر جانبداری سے کی جانے والی کوششوں کو نہ صرف اجازت بلکہ سہولت بھی فراہم کریں۔

بیسویں صدی کے اواخر سے ایسے تنازعات میں اضافہ ہوا ہے جو ملکوں کے مابین نہیں بلکہ بعض ممالک کی سرحدوں کے اندر ہی پھوٹ پڑے۔ ایسے مسلح تصادم میں حکومتی افواج کا اپنے مخالفین سے اور بعض اوقات حریف گروہوں کا ایک دوسرے سے سامنا ہوتا ہے۔

اسی طرح شناخت کی بنیاد پر یا طبقاتی تقسیم کی بنیاد پر تنازعات بھی بڑھے ہیں جو متعدد صورتوں میں بڑے پیمانے پر تشدد اور بہت سے لوگوں کی نقل مکانی کا باعث بھی بن جاتے ہیں۔ ایسے تنازعات میں شامل گروہوں کی کوئی منضبط شکل بھی کم ہی ہوتی ہے۔

ان رجحانات نے اعتماد حاصل کرنا اور اس بات پر مخاطب کو قائل کرنا زیادہ مشکل بنا دیا ہے کہ ریڈ کراس اور ہلالِ احمر انجمنیں محض اپنے اصولوں کی پاسداری میں مصروف ہیں۔ مشکل کا اندازہ اس مثال سے لگایا جا سکتا ہے کہ ڈیموکریٹک ریپبلک آف کانگو میں امدادی سرگرمی کے دوران ریڈ کراس کو ۴۰ مسلح گروہوں سے بات چیت کرنا پڑی۔ ایسے حالات میں نتیجہ خیز تعلقات استوار کرنے میں وقت لگتا ہے لیکن رفتہ رفتہ جب عمل الفاظ کے مطابق ہو تو اعتماد بن ہی جاتا ہے۔

انسانیت کے لیے سنگین خطرات

اکیسویں صدی میں ان مشکلات میں اضافہ ہی ہوا ہے اور امدادی اداروں کے مصائب بڑھے ہیں۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے حملوں کے بعد دنیا بھر میں ریاستوں کے مابین اور ریاستی و غیر ریاستی حریفوں کے درمیان ہونے والی کش مکش نے جنگ کی حرکیات (Dynamics) کو ہی تبدیل کر دیا اور نتیجتاً انسانی بنیادوں پر کی جانے والی سرگرمی بھی متاثر ہوئی، جس کا اثر بالعموم سویلین آبادی کے لیے بہت سنگین رہا ہے۔

اس عالمی ماحول میں ایک نئی نظریاتی تقسیم یا انتہا پسندانہ رجحانات کی تشکیل ہوئی ہے۔ ریاستوں نے ان گروہوں سے سختی سے نمٹنے کا فیصلہ کیا جنہیں وہ دہشت گرد قرار دیتی ہیں تو ایسے حالات بھی پیدا ہوئے جب خود ریاستی اقدامات بھی ان حدود سے تجاوز کر گئے جو تکریمِ انسانیت کے بین الاقوامی قانون اور انسانی حقوق کے قانون نے طے کیے ہیں۔ دوسری طرف ان حکومتوں سے برسرِ پیکار غیر ریاستی گروہوں نے بھی مزاحمت اور تشدد کے غیر روایتی طریقوں کو اپنایا، جن میں شہری آبادی اور 'آسان اہداف' کو دانستہ نشانہ بنانا شامل تھا۔ بعض صورتوں میں انسانی تنظیموں کو بھی دانستہ نشانہ بنایا گیا۔

ایسے تقسیم اور تفریق پر مبنی ماحول میں، جہاں ایک فرد یا تو دوست کے طور پر دیکھا جارہا ہو یا دشمن کے طور پر، ہر ایک سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ ضرور دوست اور دشمن کی تقسیم کے کسی ایک جانب کھڑا نظر آئے۔ ایسے میں خود مختاری اور غیر وابستگی کی بنیاد پر کام کرنے والی تنظیموں کی مشکلات کئی گنا بڑھ جاتی ہیں۔

انسانی بنیادوں پر کسی سرگرمی کے لیے ایک اور بڑی مشکل ریاستی سطح پر ۱۹۸۰ء کے بعد سے یہ بڑھتا ہوا رجحان ہے کہ فوجی کارروائی کو انسانی بنیادوں پر جواز فراہم کیا جائے اور اس عمل میں انسانی ہمدردی پر مشتمل اقدامات کو اپنی فوجی اور سیاسی حکمتِ عملی کے ایک حصے کے طور پر (دلوں کو جیتنے کے لیے) استعمال کیا جائے۔

بدقسمتی سے امدادی عطیات اور کارروائیاں جنگی حالات میں سیاسی اہداف کے حصول کے لیے ایک لازمی عنصر بن چکی ہیں اور کچھ حکومتیں انسانی ہمدردی کی سرگرمی کو فوجی مہمات، قوم سازی اور کمزور ریاستوں کے استحکام سے نتھی کر رہی ہیں۔ اسی طرح کچھ مسلح گروہ بھی امدادی کارروائیوں کو مقامی آبادی کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جنگ میں مصروف گروہوں کو اپنے زیرِ قبضہ علاقے میں موجود افراد کے تحفظ اور مدد کے لیے کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ تو ان کی قانونی ذمہ داری ہے کہ دورانِ جنگ وہ ایسے اقدامات کریں جیسے زخمی عام شہریوں کو میدانِ جنگ سے نکالنا وغیرہ۔ لیکن الجھن وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں بظاہر انسانی بنیاد پر کی جانے والی سرگرمی کو دل جیتنے کے لیے وسیع تر مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ لڑائی کا دوسرا فریق یا دیگر متاثرہ گروہوں میں سے کوئی ان طبقات کو

نشانہ بنانا شروع کر دیں جو کسی وجہ سے دوسرے گروہ کے سیاسی یا فوجی مقاصد سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ جب انسانی ہمدردی کی سرگرمی دشمن کو شکست دینے میں حکمتِ عملی کے ایک ہتھیار کے طور استعمال کی جانے لگے تو اس میدان میں موجود امدادی اداروں کے لیے مسائل بے پناہ بڑھ جاتے ہیں۔

ذیل میں تکریمِ انسانیت کے ان سات اصولوں کی وہ تعریف بیان کی گئی ہے جو خود تحریک ان اصولوں کے لیے استعمال کرتی ہے اور اس کے بعد ان میں سے ہر ایک کی مختصر وضاحت پیش کی گئی ہے۔ قارئین کو یہ سمجھنے میں مدد ملے گی کہ آخر وہ کون سی بنیادیں ہیں جو ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کے عملے اور رضاکاروں کو مشکل ترین حالات میں بھی رسائی فراہم کرنے اور ان کے کام کی ترجیحات اور سمت متعین کرنے میں مددگار ہوتی ہیں اور ایسی کیا نزاکتیں اور مشکلات ہیں جو عمل کے میدان میں ان اصولوں کی پاسداری کو ایک پیچیدہ عمل بنا سکتی ہیں۔

پہلا اصول: انسانیت

> ''انٹرنیشنل ریڈ کراس اور ہلالِ احمر تحریک، جو میدانِ جنگ میں زخمیوں کو بلا تخصیص مدد پہنچانے کے جذبے کے تحت وجود میں آئی ہے، اپنے قومی اور بین الاقوامی کردار میں یہ کوشش کرتی ہے کہ جہاں کہیں انسان مصیبت کا شکار ہوں، وہاں یہ درپیش مصائب سے بچاؤ اور انہیں دور کرنے کا اہتمام کرے۔ اس کا مقصد زندگی اور صحت کا تحفظ اور بنی نوع انسان کے وقار کو بچانا ہے۔ یہ تحریک تمام لوگوں کے درمیان افہام و تفہیم، یگانگت، معاونت اور پائیدار امن کے لیے کوشاں ہے۔''

انسانیت وہ آفاقی اصول ہے جو اس تحریک کے کام کا اصل محرک ہے اور جو دنیا کی ہر ثقافت میں دوسروں کی مدد کے فطری جذبے کی صورت میں موجود ہے۔ اس اصول میں مشترک انسانی اقدار کو سمویا گیا ہے جیسے دردمندی، ہمدردی، امدادِ باہمی، دوسروں کے مصائب دور کرنے کی خواہش اور انہیں آئندہ کی تکلیفوں سے بچانے کی جستجو۔ یہی تصورات تقریباً ہر معاشرے میں قانون، اخلاقیات اور رواج کی بنیاد بنتے ہیں۔ انسانیت کے اصول میں بیان کردہ الفاظ 'بچاؤ'، 'تحفظ'، 'دور کرنا' اور 'وقار کو بچانا' سب ان اقدار کے عملی پہلو ہیں۔

دنیا بھر میں ایسے رضاکار جو اس اصول پر یقین رکھتے ہوں، وہ مشکل حالات میں اپنی خدمات پیش کرنے کے لیے ابتدائی طبّی امداد کی تربیت لیتے ہیں، فوری امداد پہنچانے والے جتھوں کا حصہ بنتے ہیں، لوگوں کو موذی امراض سے متعلق آگہی فراہم کرتے ہیں، خون عطیہ کرتے اور بزرگوں کی خدمت کرتے ہیں۔ اسی کی بنیاد پر طبیب اپنے وقت کی قربانی دے کر مشکل اور پرخطر مقامات پر مریضوں تک پہنچتے ہیں۔ اسی اصول سے وابستہ افراد دور دراز کے علاقوں میں بسنے والے اجنبیوں کے لیے اپنا وقت اور پیسہ خرچ کرتے ہیں۔

انسانیت کے اس اصول کے بہت سے بنیادی اجزا بین الاقوامی قانون میں سمائے ہوئے ہیں اور مختلف حالات میں انسانوں کو بدسلوکی سے بچانے میں مؤثر ثابت ہوتے ہیں اگرچہ مختلف صورتوں میں ان کا اثر مختلف ہوتا ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر صورت میں یہ قوانین بہت مؤثر ثابت نہیں ہوئے لیکن ایسی مثالوں کی بھی کمی نہیں جہاں دلیر اور ہمدرد افراد نے بین الاقوامی قانون اور ان اصولوں کی چھتری تلے متاثرہ افراد کو قابلِ قدر معاونت فراہم کی۔

۱۹۴۹ء کے جنیوا معاہدات اور ان کے اضافی پروٹوکولز میں بھی بنیادی نکتہ یہی اصول ہے اور اسی کی بنیاد پر جنگ کے وہ اصول طے پائے ہیں جن کی بالادستی قائم رکھنے پر دنیا کے تقریباً تمام ممالک رضامند ہیں۔ لیکن انسانی ہمدردی پر مبنی اس معاونت کا بھی مؤثر ترین پہلو انفرادی سطح پر ہی سامنے آتا ہے۔ امدادی کارکنان اور متأثر افراد کا باہم رابطہ مختصر اور بار بار ہوتا ہے لیکن اس دوران وہ دیگر افراد سے بھی توجہ ہٹا نہیں سکتے، ان کی بات کو سننا، ان سے ہمدردی کا اظہار کرنا اور ان کی تکلیف کو سمجھنا وہ عمل ہے جس کے نتیجے میں تحریک کے کارکنان مشکل میں مبتلا افراد کے قریب ہو جاتے ہیں۔ ان طریقوں سے شاید ان کی کچھ زیادہ مدد تو نہیں ہوتی لیکن مشکل ترین حالات میں ان کی توقیر ضرور سلامت رہتی ہے۔

انفرادی رابطوں کی اس اہمیت کے باوجود انسانی ہمدردی کی تنظیمیں جدید ترین ٹیکنالوجی اور وسائل کو بھرپور استعمال کرتی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کے ذریعے انسانی ہمدردی کے نئے انداز اور زاویئے بھی سامنے آئے ہیں۔

تحفظ کی فراہمی

جب آپ لوگوں کے قریب ہوتے ہیں تو انسانیت کے اصول سے وابستہ ایک اور تصور بھی اجاگر ہوتا ہے، اور وہ ہے تحفظ۔ مسلح تصادم، وسیع پیمانے پر ہونے والے تشدد اور قدرتی آفات میں لوگ شدید مشکل میں گھر جاتے ہیں۔ اگر انہیں بے گھر ہونا پڑے تو عارضی کیمپوں میں عام حالات کی طرح پولیس، ہمسایوں، اہلِ خاندان وغیرہ کی معاونت دستیاب نہیں ہوتی۔ ایسے حالات میں اس تحریک سے وابستہ افراد آگے بڑھ کر ان کے لیے حالات کو محفوظ تر بنانے کی سعی کرتے ہیں۔

پُر امن حالات میں زندگی اور صحت کے تحفظ کے اقدامات میں بیماریوں، آفات، حادثات، یا افلاس و جرائم سے بچاؤ کی کوششیں شامل ہیں۔ تاہم انسان دوست تنظیموں کا کام پولیس یا فوج کی طرح لوگوں کو بچانا نہیں بلکہ یہ صرف متعلقہ حکومتوں اور گروہوں کو قواعدِ جنگ اور انسانی حقوق کی پاسداری پر آمادہ کرنے کے لیے ہی کوششیں کر سکتی ہیں۔ اس کے علاوہ ریڈ کراس کی بین الاقوامی کمیٹی مسلح تصادم کے دوران گرفتار شدہ افراد کی دیکھ بھال کے لیے قابلِ قدر کوششیں کرتی ہے۔

مصائب کی روک تھام اور انہیں دور کرنا

تحفظ اور بچاؤ کا کلیدی تعلق مصائب و آفات کی روک تھام سے ہے۔ انسانی تنازعات یا قدرتی آفات میں بالعموم مقامی آبادی چھت، صاف پانی، کھانے، اور بطورِ انسان احساسِ عزت تک سے محروم ہو جاتی ہے۔ بہت سوں کو اپنے قریبی عزیزوں کی جدائی کا صدمہ بھی پہنچتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک کھانے، پانی اور چھت کا بندوبست کرتی ہے، انہیں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے میں مدد دیتی ہے، صحت کی دیکھ بھال کی بہتر سہولیات فراہم کرتی ہے اور گمشدہ افراد کی تلاش میں معاونت کرتی ہے۔

خود اعتمادی اور خود انحصاری کی بحالی

ریڈ کراس اور ہلالِ احمر تحریک یہ چاہتی ہے کہ اس کی معاونت کے نتیجے میں لوگ صحت مندانہ، مثبت، خود مختار اور معمول کی زندگی گزار سکیں۔ انسانیت کے اصول کا ایک مرکزی نکتہ ''بنی نوع انسان کے وقار کو بچانا'' ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ معاونت کی شکل ایسی ہونی چاہیے کہ جس میں لوگ بالکل بے اختیار نہ ہو جائیں اور ان کی عزتِ نفس پر حرف نہ

آئے۔ اس معاونت کے نتیجے میں لوگوں کو پہلے سے زیادہ مضبوط، محفوظ اور آئندہ مشکلات کے سامنے کے لیے زیادہ بہتر طور پر تیار ہونا چاہیے۔

سالہا سال سے تحریک ایسے اقدامات کر رہی ہے جن کے نتیجے میں لوگ چھوٹے عطیات، قرضوں اور تربیت کو بروئے کار لا کر زندگی کی گاڑی چلا سکیں۔ بعض صورتوں میں کسانوں کو بیج اور اوزار دیئے جاتے ہیں یا جانوروں کے لیے ویکسین کا اہتمام کیا جاتا ہے یا دیگر اقدامات کے ذریعے زندگی کو اس کی ڈگر پر لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

دوسرا اصول: غیر وابستگی

> ''تحریک شہریت، نسل، مذہبی عقائد، طبقے یا سیاسی آراء کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں برتتی۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ صرف لوگوں کی ضرورت ہی کو مدّ نظر رکھتے ہوئے افراد کی مشکلات کا ازالہ کرے اور فوری توجہ کے متقاضی معاملات کو ترجیح دے۔''

کچھ سال پہلے، جنوب مشرقی ایشیا کی ایک قومی ہلالِ احمر انجمن کا ایک نوجوان رضاکار چند دیگر رضاکاروں کے ساتھ امدادی سامان لے کر سیلاب سے متاثرہ گاؤں میں پہنچا۔ اس سے پہلے کہ سامان کی تقسیم شروع کی جاتی، ایک صاحب نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا کہ وہ مقامی سماجی رہنما ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ امداد کا زیادہ مستحق کون ہے، اس لیے امدادی سامان کی تقسیم کا کام اس کے سپرد کر دیا جائے۔ ایک اجنبی علاقے میں شاید یہ پیش کش بہت سوں کو بھلی محسوس ہو لیکن اپنے تجربے اور تربیت کی بنا پر ہلالِ احمر کے رضاکار جانتے تھے کہ ایسا کرنے سے غیر وابستگی کا اصول متاثر ہو گا۔ ان کے پاس یہ جاننے کا کوئی

طریقہ نہ تھا کہ پیش کش کرنے والا فرد حقیقی مستحقین تک امداد پہنچا رہا ہے یا ذاتی تعلقات یا سیاسی بنیادوں پر لوگوں کو نواز رہا ہے۔ اس لیے اس کی پیش کش کو تسلیم نہیں کیا گیا۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ غیر وابستگی عملی اور اخلاقی دونوں حوالوں سے اہم ہے۔ اگر امداد ان تک ہی نہ پہنچے جو اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں تو بھلا اس میں تکریمِ انسانیت کہاں رہی؟ تاہم اصولوں کی پاسداری کی قیمت بھی چکانا پڑتی ہے۔ اپنی غیر جانبدارانہ رائے بنانے میں وقت لگتا ہے، لوگوں سے بات کرنا، ان کی بات سننا، ان کی ضروریات کو سمجھنا، اور یہ تعین کرنا کہ کس کو کیا دیا جانا چاہیے، وقت لیتا ہے۔ اور یہ وقت لوگوں کی بے چینی میں اضافے کا باعث بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ ایک مناسب بات ہے اس لیے بالعموم لوگ اس اندازِ کار کو سراہتے ہیں۔

عدم امتیاز: انسانی خدمت کا اصل جوہر

عدم امتیاز اصولِ انسانیت کا ایک اہم جزو ہے، جس کا اظہار غیر وابستگی کے اصول میں ہوتا ہے۔ یہ شروع ہی سے جنیوا کنونشنز کا حصہ ہے۔ ۱۸۶۴ء کے جنیوا کنونشن میں زخمی اور بیمار جنگجوؤں کو جمع کرنے اور ان کے علاج کی شق موجود تھی، چاہے ان کی شہریت کچھ بھی ہو۔ ۱۹۴۹ء کے جنیوا معاہدات میں عدم امتیاز کی اس ضرورت کو مزید پھیلایا گیا اور اس میں یہ شامل کیا گیا کہ جنس، نسل، شہریت، مذہب، سیاسی آراء یا ایسے کسی بھی دوسرے معیار پر کسی سے منفی امتیاز نہیں برتا جائے گا۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ مسلح تصادم یا خانہ جنگی کے دوران دوست اور دشمن سب ہی امداد کے مستحق ہیں۔ اسی طرح انسانی ہمدردی کی تنظیمیں جو اس تحریک کا حصہ ہیں، وہ اپنے ارکان، رضاکاروں یا عملے کے چناؤ میں بھی امتیاز نہیں برت سکتیں۔ غیر وابستگی کا تقاضا یہ

بھی ہے کہ انسانیت کی مدد میں مصروف افراد ذاتی پسند ناپسند اور وابستگی کو آڑے نہ آنے دیں۔ گویا ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیے کہ امداد و معاونت سے متعلق ہر فیصلہ تمام تعصبات، ذاتی پسند ناپسند اور ترجیحات کو پسِ پشت ڈال کر صرف حقائق ہی کی بنیاد پر کیا جائے۔

اسی ضمن میں ریڈ کراس کی بین الاقوامی کمیٹی کی ذمہ داریوں میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ کوشش کرے کہ کسی تنازع یا داخلی کشمکش کے دوران زیرِ حراست افراد بھی امتیازی سلوک کا نشانہ نہ بن جائیں۔ ریڈ کراس کے نمائندے حراستی مراکز میں جا کر ذمہ داران کو قائل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ تمام قیدیوں کے لیے انسانیت پر مبنی رویہ اپنائیں۔ تاہم ہر مختلف سلوک امتیازی نہیں ہوتا۔ یہ عین ممکن ہے کہ کسی کمزور یا بیمار مریض کو دیگر کی نسبت ایک کمبل زیادہ دے دیا جائے۔ اس لیے غیر وابستگی کا ایک اور عنصر متناسب معاونت کا بھی ہے۔

متناسب معاونت

عدم امتیاز کا مطلب سب کے لیے مساوی مدد نہیں۔ بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے گا کہ کون مدد کا کس قدر حق دار ہے اور کس کی ضرورت کتنی فوری ہے۔ اسی بنیاد پر امداد سب سے پہلے ان تک پہنچائی جاتی ہے جنہیں اس کی فوری ضرورت ہے۔

بین الاقوامی قانون برائے تکریمِ انسانیت کا یہ بھی تقاضا ہے کہ بعض خاص طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد کو امداد اور معاونت فراہم کرنے میں ترجیح دی جائے، جیسے بچوں اور بوڑھوں کو۔ بیماروں اور زخمیوں سے یکساں ہمدردی کا سلوک کیا جاتا ہے اور کسی کو اضافی توجہ کی بنیاد صرف طبّی امداد کی فوری ضرورت ہی ہے۔

ایک پیشہ ورانہ ضرورت

غیر وابستگی کا اصول مسلسل محنت مانگتا ہے۔ اس اصول کی بالادستی کے لیے تمام تر انحصار انسانی ہمدردی کے اداروں سے وابستہ افراد اور ان کی تربیت پر ہی نہیں ہے بلکہ قواعد، ضوابط، پیشہ ورانہ معیارات اور طریقہ ءکار پر مبنی ایسے نظام تشکیل دیئے گئے ہیں جو اس اصول کی ہر ممکن حد تک پاسداری کو یقینی بنا سکیں۔

تیسرا اصول: غیر جانب داری

> ''تمام لوگوں کا اعتماد مسلسل حاصل رکھنے کی خاطر، تحریک کسی بھی چپقلش میں فریق نہیں بنے گی اور نہ ہی کسی بھی وقت سیاسی، نسلی، مذہبی یا نظریاتی نوعیت کی تقسیم کا حصہ بنے گی۔''

غیر جانبداری کا اصول انتہائی اہم ہونے کے باوجود شاید سب سے کم سمجھا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ شاید غیر جانبداری سے مراد عدم شراکت یا لاتعلقی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ غیر جانبداری کا یہ اصول انسانیت اور غیر وابستگی کے اصولوں کو بروئے کار لانے کی بنیاد بنتا ہے۔

اسی کی بنیاد پر کسی بھی تنازع کے تمام فریق تحریک پر اعتماد کر پاتے ہیں۔ اسی کی وجہ سے تحریک کے رضاکار قیدیوں سے مل پاتے ہیں، اپنے نشان کو ظاہر کر کے امدادی کاروان متنازع علاقے میں لے جا سکتے ہیں، اور اس کے رضاکاروں پر حملے کے خدشات کم تر ہوتے ہیں۔ تحریک کے رضاکار بے پناہ دباؤ کا مقابلہ کر کے خود کو کسی ایک فریق کی جانب جھکاؤ سے روکتے ہیں اور بعض اوقات اس کے نتائج سنگین بھی ہو سکتے ہیں۔ جن ممالک میں داخلی

تصادم جاری ہو، وہاں بعض اوقات ریاستی افواج کے لیے یہ سمجھنا مشکل ہوتا ہے کہ ریڈ کراس یا ہلالِ احمر کی قومی تنظیم ان مسلح گروہوں کی سرگرمیوں کی مذمت کیوں نہیں کرتی جو ان کے نزدیک مجرم ہیں، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ ایسے جنگجوؤں کو طبّی امداد پہنچانا چاہتی ہے جو اب لڑائی کے قابل نہیں رہے۔ دوسری طرف مسلح گروہ اس تنظیم کے حکومتی اداروں سے روابط کی بنیاد پر اسے شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ایسے میں بعض اوقات رضاکاروں پر حملے، انہیں زخمی کرنے، یہاں تک کہ ہلاک کر دیئے جانے کے واقعات بھی ہو جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ غیر جانبداری کے اصول پر چلنا آسان نہیں ہے، اور یہ بھی درست ہے کہ ہر فرد کے اپنے بھی کچھ خیالات ہوتے ہیں۔ حالات کے تناؤ اور جذبات کی شدت میں بھی تحریک کے رضاکاروں سے توقع یہی ہوتی ہے کہ وہ خود پر قابو رکھتے ہوئے ذاتی احساسات و خیالات کے اظہار سے گریز کریں گے اور اپنے مقصد پر توجہ مرکوز رکھیں گے۔ ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ یہ افراد اپنی رائے میں بھی غیر جانبدار ہوں لیکن اپنے عمل میں انہیں بہر حال غیر جانبداری ہی کو اپنانا ہے۔

غیر جانبداری ریڈ کراس اور ہلالِ احمر تحریک کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ کسی تنازع کے تمام فریقوں سے رابطہ استوار رکھ سکے تاکہ لڑائی سے متاثرہ افراد تک انسانی ہمدردی کی بنیاد پر امداد پہنچائی جا سکے۔ کسی بھی فریق سے اس کے رابطوں کا یہ مقصد ہر گز نہیں کہ تحریک اس فریق کے موقف یا اقدامات کو درست سمجھتی ہے۔

غیر جانبداری کا مطلب یہ تو ضرور ہے کہ تنازع کا حصہ نہ بنا جائے لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ تحریک سنگین انسانیت سوز معاملات پر بھی خاموش رہے۔ مسلح

تنازعات میں ظلم اور بد سلوکی کا راستہ روکنا تحریک اور اس سے متعلق تمام عناصر اور افراد کی بنیادی ذمہ داری ہے، اس لیے تصادم کا حصہ بننے والے تمام گروہوں سے رابطہ کر کے انہیں بین الاقوامی قانون برائے تکریمِ انسانیت کے تحت ان کی ذمہ داریوں کی یاد دہانی کروانا ہر حال میں لازم ہے۔ اسی حکمتِ عملی کے تحت تحریک بعض جنگی اسباب کے استعمال کی مخالفت بھی کرتی ہے جیسے جوہری ہتھیار اور بارودی سرنگیں، جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے ہی تکریمِ انسانیت کے قوانین کے خلاف ہیں۔ اسی طرح مہاجرین اور پناہ گزینوں کے لیے بہتر قوانین کے لیے آواز اٹھانا یا صحت و سلامتی سے متعلق امور کے حوالے سے کوشش کرنا بھی غیر جانبداری کو متاثر نہیں کرتا۔

غیر جانبداری کی قیمت

غیر جانبداری کی قیمت بھی ادا کرنا پڑتی ہے۔ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ تحریک کسی ایک گروہ کے سیاسی مقاصد کو پورا نہ کر رہی ہو یا اس کی کاوشوں کو کسی فوجی مہم کا حصہ نہ سمجھ لیا جائے، رضاکاروں کو ایسے کئی فوائد سے انکار کرنا پڑتا ہے جو ان کے کام کو آسان بنا سکتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ حکومتیں، اقوامِ متحدہ، غیر سرکاری تنظیمیں اور مذہبی گروہ کسی تنازع میں غیر جانبدار ہوں یا یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بنیادی اصولوں کا اطلاق اس طرح نہ کر رہے ہوں جیسا کہ خود تحریک تقاضا کرتی ہے۔

مثال کے طور پر اپنی سرگرمی کو اقوامِ متحدہ کی امن قائم رکھنے والی افواج سے الگ رکھنے کے لیے ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کو اپنے افراد اور سامان کے لیے علیحدہ انتظامات کرنا ہوتے ہیں کیونکہ یہ امکان موجود ہے کہ امن فوج کسی ایک فریق کے لیے مفید ہو۔ بعض اوقات یہ ضرور ہوتا ہے کہ نقل و حمل کے لیے اقوامِ متحدہ کی گاڑیاں اور جہاز ہی واحد

دستیاب ذریعہ ہوتا ہے۔ اس سب کے باوجود غیر جانبداری کا یہ اصول عملی میدان میں نہایت موثر ثابت ہوتا ہے اور جہاں دیگر بین الاقوامی تنظیمیں نہیں پہنچ پاتیں، وہاں بھی آئی سی آر سی کو رسائی مل جانے میں یہی اصول کارفرما ہوتا ہے۔

چوتھا اصول: خود مختاری

''یہ تحریک خود مختار ہے۔ قومی انجمنیں اگرچہ انسانی خدمات میں اپنی حکومتوں کی معاون اور اپنے اپنے ملک کے قوانین کے تابع ہیں، مگر انہیں اپنی آزادی کو برقرار رکھنا ہوگا تاکہ یہ ہر وقت تحریک کے اصولوں کی پاسداری کر سکیں۔''

ڈیڑھ صدی قبل جب ریڈ کراس اور ابتدائی قومی انجمنیں وجود میں آئیں، تو ان کے سربراہوں نے اسی وقت یہ ادراک کر لیا کہ خود مختاری اس کام کے لیے کس قدر اہم ہے۔ قومی انجمنوں کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ محض ضرورت کی بنیاد پر اپنے فیصلے کر سکیں اور کسی سیاسی، فوجی یا دیگر قوت کے تابع نہ ہوں۔ آج بھی خود مختاری اتنی ہی اہم ہے۔

اپنے وسیع تر مفہوم میں خود مختاری کا مطلب یہ ہے کہ تحریک کے ارکان کو ہر ایسی سیاسی، نظریاتی یا معاشی مداخلت کی کوشش کی مزاحمت کرنی چاہیے، جو انسانیت، غیر جانبداری اور غیر وابستگی کے بنیادی اصولوں پر عمل میں رکاوٹ بنے۔

عمل کی آزادی

اس کی ایک مثال یہ ہے کہ کوئی بھی قومی انجمن ایسی کوئی مالی مدد وصول نہیں کر سکتی جس کا ہدف سیاسی، نسلی یا مذہبی بنیاد پر کچھ خاص لوگ ہوں اور دیگر افراد کو اس سے محروم رکھا جائے چاہے ان میں سے کچھ زیادہ ضرورت مند ہی کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح اگر کوئی قومی

انجمن اپنی امدادی سرگرمی کو اپنے معیارات سے ہٹ کر عوامی دباؤ کی بنیاد پر اس طرح ترتیب دینے کا فیصلہ کرلے تو عین ممکن ہے کہ اس کا یہ اقدام صرف غیر موزوں ہی نہیں بلکہ نقصان دہ بھی ہو۔ ایسے اقدامات سے عوامی تنقید کو ہوا ملتی ہے اور عمومی اعتماد کو ٹھیس پہنچتی ہے۔

حکومتوں کی معاونت اور خود مختاری

یہ بہت ضروری ہے کہ ملکی ادارے قومی انجمن کی خود مختاری کو اور اس ممتاز قانونی حیثیت کو سمجھتے اور اس کا اعتراف کرتے ہوں جو اسے جنیوا معاہدات، تحریک کے قوانین اور ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کی بین الاقوامی کانفرنس کی منظور کردہ قراردادوں کے تحت حاصل ہے۔ ان قانونی بنیادوں نے قومی انجمنوں کو تکریمِ انسانیت سے متعلق امور میں حکومتی اداروں کے لیے معاون (Auxiliary) قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ قومی انجمنیں اپنی حکومتوں کی ماتحت ہیں بلکہ صرف یہ کہ انہیں حکومتی اقدامات یا ایسی عوامی خدمات میں شریک کیا جاسکتا ہے جہاں حکومت کو ضرورت ہو۔

بحیثیت معاون اپنی اس حیثیت کی وجہ سے قومی انجمنوں کا یہ فرض ہے کہ انسانی خدمت کے کسی بھی کام سے متعلق ان تک جب حکومت کی جانب سے درخواست آئے تو اسے سنجیدگی سے لیں۔ اس طرح حکومت عوامی خدمات اور ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے قومی انجمن سے بھرپور استفادہ کرسکتی ہے۔ لیکن حکومت کو قومی انجمن سے ایسا کوئی مطالبہ نہیں کرنا چاہیے جو بنیادی اصولوں سے متصادم ہو۔ ۱۹۴۹ء کے جنیوا معاہدات اور ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کی بین الاقوامی کانفرنس کی رکن ہونے کی حیثیت سے تمام ریاستیں اس بات کی پابند ہیں کہ وہ بنیادی اصولوں پر عمل درآمد کے لیے قومی انجمنوں کے حق کا

احترام کریں اور ان کے کام اور فیصلوں میں مداخلت نہ کریں۔ تاہم اگر حکومت کی جانب سے موصول ہونے والی کوئی درخواست بنیادی اصولوں سے مطابقت نہ رکھتی ہو تو یہ ممکن ہے کہ کوئی قومی انجمن ریڈ کراس کی بین الاقوامی کمیٹی یا بین الاقوامی فیڈریشن اس درخواست پر عمل سے انکار کر دے۔ اسی طرح غیر وابستگی کی بنیاد پر قومی انجمن کمزور طبقات کی مدد کا ازخود بھی فیصلہ کر سکتی ہے، چاہے اسے حکومت کی جانب سے کوئی درخواست نہ بھی موصول ہوئی ہو۔

حکومتی اداروں، عطیات دینے والے بین الاقوامی اداروں، انسانی خدمت کی دیگر تنظیموں اور مقامی آبادی کے ساتھ کام کرتے ہوئے خود مختاری کو برقرار رکھنا مشکل مگر ضروری ہے، بالخصوص بڑے پیمانے پر ہونے والی تباہی میں جب کم وقت اور وسائل میں زیادہ مؤثر کام کے لیے باہم تعاون اور رابطے کی ضرورت بار بار پیش آتی ہے۔ اگرچہ مسلح تنازع یا قدرتی آفت کی بیشتر صورتوں میں دیگر اداروں اور تنظیموں کے ساتھ مل کر کام کرنا کئی طرح سے آسانی کا باعث ہو سکتا ہے لیکن جب کوئی مالی، سیاسی، یا فوجی مقصد تحریک کی غیر جانبداری کے آڑے آنے لگے تو اس کے ذمہ داران کے لیے لازم ہے کہ اپنی آزادی کا برملا اظہار کرنے کے لیے مشکل راہ سے بھی گریز نہ کریں، کیونکہ انسانی خدمات اور سیاسی یا فوجی سرگرمیوں میں اگر خطِ امتیاز کو دھندلا دیا جائے تو تنازع سے متاثر ہونے والے تمام افراد کو محض انسانی بنیاد پر تحفظ اور مدد پہنچانا از حد مشکل ہو جاتا ہے۔

پانچواں اصول: رضاکارانہ خدمت

''تحریک کی بنیاد رضاکارانہ خدمت پر ہے اور اس کا مقصد کسی طور بھی منفعت پسندی نہیں ہے۔''

ہر روز دنیا بھر میں متعدد افراد اپنا وقت اور توانائی دوسروں کی بلا معاوضہ مدد میں لگاتے ہیں۔ ریڈ کراس اور ہلالِ احمر تحریک کے ساتھ بھی تقریباً ایک کروڑ ستر لاکھ رضاکار وابستہ ہیں۔[2] بین الاقوامی فیڈریشن کے ایک مطالعہ میں لگائے گئے ایک تخمینے کے مطابق ۲۰۰۹ء میں ان رضاکاروں کی خدمات کا مالی تخمینہ ۶ ارب امریکی ڈالر سالانہ کے مساوی تھا۔[3]

رضاکارانہ خدمت تحریک کے بنیادی اصولوں میں سے ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ تحریک کے کام کا اصل محرک انسانی خدمت کا ذاتی جذبہ ہونا چاہیے نہ کہ کوئی مالی منفعت، عزت، معاشرتی مقام یا ذاتی ترقی۔ یہ اصول بلا معاوضہ خدمات پر بھی لاگو ہوتا ہے اور ان خدمات پر بھی جن کے لیے ادائیگی کی جاتی ہے۔ تحریک کا عملہ اگرچہ تنخواہ لیتا ہے لیکن ان کے لیے بھی اصل مقصود لوگوں کی بے لوث مدد ہے۔

بے لوث اور رضاکارانہ خدمت کا یہی جذبہ تحریک کے دیگر اصولوں کو تقویت دیتا ہے۔ جب افراد ذاتی فوائد سے بالاتر ہوں اور تنظیموں کا مطمع نظر مالی نفع نہ ہو، تب ہی لوگ یہ اعتماد کر پاتے ہیں کہ تحریک اپنا کام کسی دباؤ یا لالچ کے تحت نہیں کر رہی۔ آگے بڑھ کر مدد کا یہ جذبہ معاشرے کو بھی باہم جوڑتا ہے اور مختلف طبقات کے درمیان صحت مندانہ ربط بھی استوار کرتا ہے۔

---

[2] IFRC, "Global Review on Volunteering Report," International Federation of Red Cross and Red Crescent Societies, 2015, https://www.ifrc.org/Global/Documents/Secretariat/1301100-Global%20Review%20on%20Volunteering%20Report_EN-LR.pdf

[3] IFRC, "The Value of Volunteers," International Federation of Red Cross and Red Crescent Societies, 2011, https://www.ifrc.org/Global/Publications/volunteers/IFRC-Value%20of%20Volunteers%20Report-EN-LR.pdf

ریڈ کراس کے ابتدائی رضاکاروں نے اگرچہ میدان جنگ کو ہی اپنا دائرہ کار سمجھا لیکن اب یہ رضاکار کئی طرح کے طبّی اور سماجی فلاح کے منصوبوں میں سرگرم عمل ہیں۔

رضاکار موجودہ دنیا میں

ایک سوال جو اکثر ذہنوں میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ کیا کسی تصادم یا قدرتی آفت کے نتیجے سے نمٹنے کے لیے رضاکارانہ انداز اب بھی کارآمد ہے؟ ہمارے نزدیک اس کا جواب یہ ہے کہ رضاکارانہ کام کو ان مسائل کے لیے کوئی حل تو نہیں سمجھنا چاہیے لیکن یہ کئی طرح سے اب بھی موثر ہے۔ بعض ممالک میں حکومتوں کے پاس وسائل کی کمی ہوتی ہے یا ان کے پاس ضروری انتظامی یا مالی ڈھانچہ نہیں ہوتا یا وہ ان مسائل سے نمٹنا ہی نہیں چاہتیں۔ وہ ممالک بھی جہاں ریاست نے عوام کی صحت و فلاح کی ذمہ داری لے رکھی ہے، یا جہاں قومی انجمنوں میں اہل اور تربیت یافتہ عملہ موجود ہوتا ہے، وہاں بھی ہر چیز مکمل اور درست نہیں ہوتی۔ کسی امدادی گروہ میں شامل کوئی طبّی ماہر کتنا ہی تربیت یافتہ اور مخلص کیوں نہ ہو، بعض امور بہر حال ایسے ہوتے ہیں جنہیں صرف ایک مقامی رضاکار ہی جان سکتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ چونکہ ریڈ کراس اور ہلال احمر کے رضاکار سرکاری ملازم نہیں ہوتے اس لیے اس بات کا امکان زیادہ ہے کہ مدد کے مستحق افراد ان پر اعتماد کر سکیں۔

مضبوط اساس

اس تحریک کی ایک بڑی قوت اس کے رضاکاروں کا وسیع جال ہے۔ یہ رضاکار ایک طرف تو مقامی آبادی میں گہری جڑیں رکھتے ہیں اور دوسری طرف مقامی حکومت یا سیاسی مصلحتوں سے آزاد بھی ہیں۔ مقامی حالات سے ان رضاکاروں کی واقفیت اور معاشرے میں ان کی قبولیت کی بنیاد پر یہ ہر مشکل صورتِ حال میں سب سے پہلے پہنچ کر سہولت کاری کرتے

ہیں۔ قومی انجمن میں ہر طرح کے سیاسی، مذہبی اور سماجی پس منظر کے رضاکار شامل نہ ہوں تو اسے تمام طبقات کا اعتماد حاصل نہیں ہو سکتا اور کسی مسلح تصادم کی صورت میں ان تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔

چھٹا اصول: اتحاد

> ''ایک ملک میں صرف ایک ہی ریڈ کراس یا ہلالِ احمر انجمن ہو سکتی ہے۔ اس میں سب لوگ شامل ہو سکتے ہیں۔ اس کی انسانی خدمات ملک بھر پر محیط ہوں گی۔''

اتحاد کا یہ اصول شاید بظاہر زیادہ اہم نہ لگتا ہو لیکن اس کی اہمیت بے حد ہے۔ دراصل یہی اصول غیر وابستگی، غیر جانبداری، عالمگیریت اور خود مختاری کی پاسداری کو ممکن بناتا ہے۔ ملک بھر میں ایک ہی قومی انجمن ہونے کے اصول کا تقاضا یہ ہے کہ اس انجمن کی شاخیں ملک بھر میں موجود ہوں۔ اسی طرح اس انجمن میں شمولیت کے دروازے تمام لوگوں پر کھلے رکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کی افرادی قوت میں متعلقہ ملک کی آبادی کے تمام حصوں کی نمائندگی ہو۔ ان عناصر کی موجودگی میں اس بات کا امکان بڑھ جاتا ہے کہ قومی انجمن مقامی جھگڑوں اور اختلافات میں غیر جانبدار رہ کر کردار ادا کر سکے اور ملک کے تمام حصوں میں حسبِ ضرورت مؤثر مدد پہنچا سکے۔

قومی انجمن میں ملک کے تنوع اور وسیع تر وابستگی کے اظہار کے لیے نہ صرف اس کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہوتے ہیں بلکہ اس کی جھلک اس انجمن کی گورننگ باڈی میں بھی موجود ہوتی ہے۔ تحریک کے قوانین میں بھی قومی انجمن کے لیے یہ تقاضا درج ہے کہ

اسے اپنے رضاکاروں اور عملے کا انتخاب نسل، صنف، طبقے، مذہب اور سیاسی خیالات سے قطع نظر ہو کر کرنا ہو گا۔

ملک بھر میں خدمات سرانجام دینے کا تقاضا اس بات کو یقینی بناتا ہے کہ ملک کے بعض علاقوں کی نسبت دیگر علاقوں کو ترجیح نہ دی جائے کیونکہ ایسا کرنا غیر جانبداری کے اصول کے منافی ہو گا۔

داخلی تصادم کی بعض صورتوں میں جب ملک کا بڑا حصہ قومی انجمن کے لیے ناقابل رسائی ہو، اس تقاضے کو پورا کرنا خاصا دشوار ہو سکتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں تحریک قومی انجمن کی بجائے کسی متعلقہ تنظیم سے عملی اشتراک کر سکتی ہے۔ جس کے ذریعے تکریمِ انسانیت کی خدمات کو انجام دیا جا سکے۔

ساتواں اصول: عالمگیریت

> ''تحریک جس میں تمام معاشروں کی حیثیت یکساں ہے اور دوسروں کی مدد کرنے میں ان کی ذمہ داریاں اور فرائض مشترکہ ہیں، عالمگیر ہے۔''

یہ آخری اصول ہمیں پہلے اصول سے جوڑتا ہے، جس میں انسانی تکالیف کو دور کرنے کا تقاضا موجود ہے، ''چاہے وہ کہیں بھی ہوں''۔ اگر دنیا کے کچھ حصوں یا معاشرے کے بعض طبقات کو نظر انداز کر دیا جائے تو تحریک انسانی تکالیف دور کرنے کے نعرے میں مخلص ہونے کا دعوی نہیں کر سکتی۔ انسانیت سے تحریک کی وابستگی سیاست، نسل اور مذہب سے بالاتر ہے۔ تکریمِ انسانیت کے اصول کا ایک لازمی عنصر عالمی یکجہتی ہے۔ جس کا اظہار عالمگیریت کے اصول میں ہوتا ہے۔ اسی لیے تحریک سے وابستہ ہر قومی انجمن کی ذمہ داری

ہے کہ وہ ضرورت کے وقت دیگر انجمنوں کی مدد کرے اور دنیا کے ہر ملک میں موجود قومی انجمن ہی تحریک کی عالمگیریت کی سب سے بڑی عکاس ہے۔

یکساں حیثیت

برابری، باہمی احترام اور مشترکہ ذمہ داری کا احساس عالمگیر انسانی خدمت کے لازم عناصر ہیں۔ انہی اقدار کی بنیاد پر یہ بین الاقوامی نظام تمام تر دباؤ کے باوجود ان بنیادی اصولوں کی مؤثر پاسداری کر پاتا ہے۔ مساویانہ حیثیت کو یقینی بنانے کے لیے تحریک اپنے قواعد کے مطابق اپنے تمام اجزاء کو انسانی خدمات کے دوران اہم فیصلوں میں شریک کرتی ہے۔ فیڈریشن کی جنرل اسمبلی، تحریک کے مندوبین کی کونسل اور ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کی بین الاقوامی کانفرنس میں ہر قومی انجمن کا ایک ووٹ ہوتا ہے۔

عالمگیریت کو درپیش چیلنجز

عالمگیریت کا اصول تحریک کے لیے بعض چیلنجز کا بھی باعث بنتا ہے۔ تحریک میں شمولیت اختیار کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے تمام قومی انجمنوں کے لیے لازم ہے کہ بنیادی اصولوں کی پاسداری کریں۔ لیکن بعض ایسے حالات پیش آجاتے ہیں جب یہ محسوس ہوتا ہے کہ کسی قومی انجمن کو اپنا کام جاری رکھنے، حتیٰ کہ اپنا وجود برقرار رکھنے کے لیے، انتہائی مشکل حالات درپیش ہیں۔ ایسے میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تحریک کو اپنے بین الاقوامی کردار کو برقرار رکھنے اور اس ملک یا جگہ پر اپنی موجودگی جاری رکھنے کے لیے دیگر بنیادی اصولوں میں سے کسی اصول سے کسی قدر انحراف کو نظرانداز کر دینا چاہیے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا کوئی بہت دوٹوک جواب نہیں ہو سکتا۔ عملی طور پر تحریک کو کسی بھی فیصلے کے لیے ہر صورتِ حال کا خوب اچھی طرح جائزہ لینا پڑتا ہے۔ اگرچہ کچھ لچک، برداشت اور مسائل و

مجبوریوں کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ دوسرے فریق کو سمجھانے کی کوشش کرتے رہنا وہ قیمت ہے جو تحریک کو اپنی عالمگیریت کو برقرار رکھنے کے لیے دینا پڑتی ہے لیکن بعض صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں جب سمجھوتہ بالکل نہیں کیا جاسکتا۔ خاص طور پر انسانیت کا اصول چونکہ پوری تحریک کے لیے روحِ رواں اور بنیادی ہدف کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے اگر کوئی قومی انجمن مسلسل انسانیت کے اصول سے انحراف کر رہی ہو یا اس کی سرگرمیاں مسلسل جانبداری پر مبنی ہوں، تو اس انجمن کے اقدامات اسے تحریک سے کاٹ دیں گے، اور ظاہر ہے کہ اس خطے میں تحریک کے کسی بھی عضو کی موجودگی باقی نہ رہنے سے اس کا اثر تحریک کی عالمگیریت پر بھی پڑے گا۔

بنیادی اصولوں کا باہم ربط

انسانیت کے اصول پر عمل دراصل تمام اصولوں کی پاسداری ہے لیکن غیر وابستہ ہونا یعنی جسے سب سے زیادہ مدد کی ضرورت اس تک پہنچنا، چاہے وہ کوئی بھی اور کہیں بھی ہو، بہت ضروری ہے۔ غیر وابستگی کے عملی مظاہرے کے طور پر حالیہ عرصے میں شام کی عرب انجمن ہلالِ احمر کو حکومت کے ساتھ کام کرنے کے باوجود اپنی غیر وابستگی ظاہر کرنا تھی اور اپنی تمام شاخوں میں رضاکارانہ خدمات کے ذریعے تکریمِ انسانیت کو اپنی ہر شاخ میں بروئے کار لانا تھا۔ تقسیم در تقسیم اس ریاست کے تمام حصوں میں اپنی شاخوں کی موجودگی اور اپنی صفوں میں تمام طبقات کی نمائندگی نے شام کی ہلالِ احمر کو اس لائق کیا کہ یہ اپنے امور میں خود مختاری اور غیر وابستگی کو برقرار رکھ سکے اور اس کے رضاکار غیر جانبدارانہ طور پر محاذ کے تمام اطراف میں کام کر سکیں۔ چونکہ شام کی یہ انجمن دنیا بھر کے نظام سے مربوط ہے، اس

لیے یہ اس بات کا برملا اظہار کر سکتی تھی کہ یہ کسی مقامی سیاسی ایجنڈے یا ہدف کے نہیں بلکہ عالمگیر انسانی اہداف کے تابع ہے۔ اس طرح اتحاد اور عالمگیریت نے وہ حالات پیدا کیے جن میں غیر وابستگی، غیر جانبداری اور خود مختاری سے تکریمِ انسانیت کی وہ خدمات انجام دی جا سکیں جن پر اس تنازع کے تمام فریقین کو اعتماد تھا۔

باب ۳

انسانی اقدار میدانِ عمل میں

ستمبر ۲۰۱۵ء میں برطانوی ریڈ کراس نے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا: ''اس وقت جب یورپی ممالک کو شدید انسانی بحران کا سامنا ہے اور مشرقِ وسطیٰ اور افریقہ سے تعلق رکھنے والے ہزاروں افراد پناہ کی تلاش میں ہیں، برطانوی ریڈ کراس کو یہ بتانے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے کہ ہم پناہ گزینوں اور نقل مکانی کرنے والوں کی مدد کیوں کرتے ہیں۔ اس وضاحت کے لیے لکھے گئے مضمون میں یہ صراحت ہے کہ اگرچہ برطانوی ریڈ کراس کے طور پر ہم برطانیہ میں موجود افراد کی مدد بہتر انداز میں کر سکتے ہیں لیکن ہمارے اصولوں کا یہ مطالبہ ہے کہ ہم جب بھی کسی ضرورت مند کو دیکھیں، ہم ان سے ان کے پاسپورٹ طلب نہ کرنے لگ جائیں۔ ہم بس انہیں عزت اور تعاون فراہم کرتے ہیں، اور اگر ہم خود بھی ایک پُر مشقت سفر کے بعد کسی نامانوس جگہ پر پہنچیں تو ہم بھی ایسا ہی استقبال چاہیں گے۔''[1]

برطانوی ریڈ کراس کا یہ موقف دراصل بنیادی اصولوں کے اطلاق کی عملی تصویر ہے، یعنی قومیت یا حیثیت سے قطع نظر شدید اور فوری مدد کے ضرورت مند ہر فرد کو غیر وابستگی اور انسانی بنیاد پر مدد فراہم کرنا؛ قومی انجمن کی اپنے فیصلوں اور انسانی خدمت میں

[1] Craig Burnett, "Why Do We Help Refugees and Migrants?", British Red Cross Blog, September 9, 2015, http://blogs.redcross.org.uk/emergencies/2015/09/why-do-we-help-refugees-and-migrants/.

خود مختاری؛ اور سیاسی امور میں بھی سیاست سے غیر جانبدار رہ کر خالص تکریمِ انسانیت کے مقاصد کے تحت موقف اختیار کرنا۔ یہ واضح طور پر ظاہر کرتا ہے کہ برطانوی ریڈ کراس کے لیے انسانیت اہم ترین قدر اور اقدامات کی اصل بنیاد ہے۔

دنیا بھر میں تنازعات، تشدد اور آفات کے متاثرین کے تحفظ اور مدد کے لیے جاری سرگرمیوں کا اصل محرک اور راستہ یہی بنیادی اصول ہیں۔ ایسے افراد جنہوں نے اپنی زندگیاں انسانیت کی بنیاد پر خدمت میں کھپا دی ہیں، ان کے تجربات ایک جانب تو خود ان اصولوں کو نکھارتے ہیں اور دوسری جانب امدادی کارکنان کو ان مشکل حالات کو بھی درست طور پر سمجھنے اور ترجیحات طے کرنے میں مدد دیتے ہیں جہاں ضروریات وسائل سے کہیں زیادہ ہوں یا متاثرین تک پہنچنے کے لیے ان امدادی کارکنان کو اپنی سلامتی کے لیے واضح خطرات نظر آرہے ہوں۔

ان اصولوں کو نظری اور عملی بنیادوں پر مسلسل پرکھا جاتا رہا ہے اور موجودہ عالمی نوعیت کے شدید اور طویل بحرانوں میں بھی انہیں مسلسل کڑے امتحان کا سامنا ہے۔ ایک جانب تو اس انسانی خدمت کو بڑھتے ہوئے سیاسی تناؤ کا سامنا ہے اور دوسری طرف خود امدادی اداروں اور ان کے کام کے انداز میں مسلسل تبدیلیاں آرہی ہیں۔

انسانی خدمت میں اقدار اور حقیقت پسندی کا امتزاج

تکریمِ انسانیت کے اصولوں کی اساسی اقدار، جیسے سخاوت، ہمدردی، رحم دلی اور انسانی زندگی و عزت کا احترام، تمام ہی مذاہب اور معاشروں میں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتی ہیں، جیسے عیسائیت میں خیرات دینا، ہندومت، جین مت اور سکھ مت میں دان کرنا، اسلام میں

زکوٰۃ اور نفل صدقات، یہودیت میں صدقہ (Tzedakah) کا تصور پایا جاتا ہے۔ یہ بنیادی اقدار انسانی زندگی کے مختلف شعبوں میں بھی جھلکتے ہیں، جیسے ضرورت کے مطابق اور بغیر کسی امتیاز کے طبّی امداد کی فراہمی طبّی اخلاقیات کے اصول میں شامل ہے۔[2] انسانی خدمت کے شعبے میں بالعموم انسانیت، غیر جانبداری، خود مختاری اور غیر وابستگی کو بنیادی اصول کے طور پر اپنا لیا گیا ہے اور انہیں بالعموم تکریمِ انسانیت کے اصولوں کا نام دیا جاتا ہے۔ اس طرح انہیں ریڈ کراس اور ہلالِ احمر تحریک کے بنیادی اصولوں سے ایک امتیاز بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے بھی اقوامِ متحدہ کے نظام کے تحت ہونے والی انسانی ہمدردی کی سرگرمیوں کے لیے انہی اصولوں کو اپنا لیا ہے۔[3] بالعموم بنیادی اصولوں اور تکریمِ انسانیت کے اصولوں کو انسانی خدمت کے رہنما اصولوں کے طور پر یکجا بیان کر دیا جاتا ہے۔[4]

---

[2] مثال کے طور پر، عالمی طبّی تنظیم (World Medical Association) کے جنیوا اعلامیے میں یہ الفاظ شامل ہیں کہ ''میں اپنے فرض اور مریض کے درمیان عمر، بیماری یا معذوری، عقیدے، نسب، صنف، قومیت، سیاسی وابستگی، نسل، جنسی رجحان، سماجی حیثیت یا کسی بھی دوسرے عنصر کو حائل نہ ہونے دوں گا/گی۔'' دیکھیے: www.wma.net/en/30publications/10policies/g1/.

[3] اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کی ۱۹ دسمبر ۱۹۹۱ء کو منظور کی گئی قرارداد نمبر ۴۶/۱۸۲ میں ہے کہ: ''تکریمِ انسانیت پر مبنی امداد انسانیت، غیر وابستگی اور غیر جانبداری کے اصولوں کی بنیاد پر ہی فراہم کی جانی چاہیے۔'' اسی طرح ۵ فروری ۲۰۰۴ء کی جنرل اسمبلی کی قرارداد میں خود مختاری کو بھی ایک تکریمِ انسانیت کی بنیاد پر امداد کی فراہمی کے لیے ایک رہنما اصول کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔

[4] ایسی تجاویز مسلسل آتی رہتی ہیں کہ اصولوں کی موجودہ فہرست میں بعض نئے اصولوں کا اضافہ کر لیا جائے۔ بالخصوص حالیہ برسوں میں یہ تجویز سامنے آتی رہی ہے کہ احتساب اور مستفید افراد کی شرکت کے اصول، ضرر نہ پہنچانے کا اصول، اور امدادی کاوشوں کے تسلسل کی ضرورت کو بنیادی اصولوں کا حصہ بنا لیا جائے۔

انسانی خدمت کے بنیادی نظریئے کے طور پر ان اصولوں کی بنیادی فکر انسانی زندگی کی قدر و قیمت سے وابستہ ہے اور ان کا بنیادی ہدف مصائب و آفات کے شکار افراد کا تحفظ ہے۔ اب جب کہ ان اصولوں کو ایک باقاعدہ ضابطے کی شکل میں لایا جا چکا ہے،[5] یہ اصول احترامِ انسانیت، خدمتِ خلق اور مختلف انسانی ضروریات کے لیے مؤثر اور مرتب اقدامات کی عملی ضرورت پر استوار ہیں۔ ایک صدی سے زائد عرصہ تک دنیا کے مختلف حصوں اور حالات میں جاری انسانی خدمت اور اس سے اخذ کردہ تجربات نے ان اصولوں کی تشریح اور عملی اطلاق کو وسعت اور نکھار بخشا ہے۔ نصف صدی قبل ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کی ویانا میں منعقدہ بیسویں بین الاقوامی کانفرنس میں سات بنیادی اصولوں کو رسمی طور پر منظور کر لیا گیا تھا۔ جین پکٹے نے ان اصولوں کی جو تشریح قلم بند کی تھی وہ اب بھی ان کی بنیاد اور دائرہ عمل کو سمجھنے کے لیے بنیادی حوالہ ہے۔[6]

---

[5] اس ضابطے میں ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کی بین الاقوامی تحریک کے بنیادی قواعد www.icrc.org/eng/resources/documents/misc/statutes-movement-220506.htm، تباہ کاری کے بعد امدادی کارروائیوں میں بین الاقوامی ریڈ کراس اور ہلالِ احمر تحریک اور غیر حکومتی تنظیموں کے لیے ضابطۂ عمل www.icrc.org/eng/resources/documents/publication/p1067.htm اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی کی ۱۹ دسمبر ۱۹۹۱ کی قرارداد نمبر ۴۶/۱۸۲، جنرل اسمبلی کی ۵ فروری ۲۰۰۴ء کی قرارداد نمبر ۵۸/۱۱۴، تکریمِ انسانیت کا چارٹر اور تکریمِ انسانیت پر مبنی سرگرمی کے کم از کم معیارات spherehandbook.org، اور معیار و احتساب سے متعلق تکریمِ انسانیت کا بنیادی معیار www.corehumanitarianstandard.org شامل ہیں۔ ان اصولوں کی ضابطہ بندی کی یہ چند مثالیں ہیں۔

[6] Jean Pictet, "The Fundamental Principles of the Red Cross," International Federation of Red Cross and Red Crescent Societies, 1979, https://www.ifrc.org/PageFiles/95341/Pictet%20Commentary.pdf

بنیادی اصول نہ صرف انسانی خدمت کے لیے کی جانے والی کاوشوں کے اصول اور بنیادوں کو متعارف کرواتے ہیں (جیسے انسانیت اور غیر جانبداری) بلکہ ان کاوشوں میں مصروف افراد و تنظیموں کے لیے درکار خصوصیات کو بھی کھول کر بیان کرتے ہیں (جیسے غیر وابستگی، خود مختاری، رضاکارانہ جذبہ، اتحاد اور عالمگیریت)۔ مثال کے طور پر غیر وابستگی کوئی جامد و دفاعی اصول نہیں بلکہ اس کا تقاضہ وہ مسلسل کوشش ہے جس کا مقصد تمام لوگوں کا اعتماد حاصل کرنا ہے تاکہ کسی پریشانی میں متاثرہ لوگوں تک پہنچنا آسان ہو۔ اس لیے غیر وابستگی ایک مستقل شعار کے بجائے خود ایک ہدف بھی ہے لیکن ایک اہم وسیلہ بھی۔ پھر یہ بھی ہے کہ انسانیت پر اصرار سے ذہن میں جو تصویر بنتی ہے اس سے قطع نظر یہ اصول دنیا بھر کے لیے کسی ایسے جامع اخلاقی معیار کا متبادل نہیں کہ انہیں ایک نظریہ قرار دیا جاسکے بلکہ ان کا اطلاق مقامی و بین الاقوامی سطح پر یکساں طور پر کیا جاسکتا ہے۔ ایک ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو ان اصولوں کا اصل مقصد انسانی خدمت کو عمل اور نتائج کے میدان میں سرانجام دینا ہے۔

ریڈ کراس، ہلالِ احمر تنظیمات اور ان پر مشتمل بین الاقوامی فیڈریشن کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ یہ جائزہ مسلسل لیا جاتا رہے کہ عملی میدان میں یہ اصولی بنیادیں کس قدر رُوبعمل اور مفید ہیں۔ اس مقصد کے لیے قومی انجمنیں جہاں انفرادی اور مقامی طور پر جائزہ لیتی رہتی ہیں وہاں اپنے تجربات کو بین الاقوامی سطح پر تحریک اور اس کے مختلف اعضاء کے سامنے بھی پیش کرتی ہیں تاکہ ایک دوسرے کے تجربات سے استفادہ کے ذریعے درپیش مسائل کا بہتر احاطہ اور تجزیہ کیا جاسکے اور یہ جانتے ہوئے کہ موجودہ دنیا میں یہ اصول کیسے مختلف حالات میں کارآمد ہیں، مختلف حالات میں بہتر حکمتِ عملی بھی وضع کی جاسکے۔

عمومی طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ ریڈ کراس کی بین الاقوامی کمیٹی ان اصولوں پر کسی سمجھوتے کو تیار نہیں ہوتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ بدلتی دنیا کے رجحانات کی روشنی میں جائزے اور ضروری تبدیلی کا عمل مسلسل جاری رہتا ہے۔ خود تحریک اپنے طرزِ عمل کی بھی مختلف پہلوؤں اور حوالوں سے جانچ کرتی ہے تاکہ یہ معلوم رہے کہ نئی دنیا میں تحریک کے مقاصد اور اصولوں کو کون سے سوالات درپیش ہیں اور انہیں عمل کا رنگ دینے میں فیصلہ سازی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ان جدید رجحانات کی کچھ جھلک ذیل میں موجود ہے۔

دورِ حاضر کے مسلح تنازعات اور بنیادی اصول

جب انسانی خدمت میں مصروف افراد اور تنظیمیں تکریمِ انسانیت کے اصولوں پر عمل کرتے ہیں تو انہیں مسلسل مشکلات سے نمٹنا پڑتا ہے اور انہیں راہداری، سلامتی اور لوگوں کی مدد کے لیے درکار وسائل ہمیشہ حاصل نہیں ہوتے۔ جنگی صورتِ حال سے رویوں میں جو تناؤ پیدا ہوتا ہے، انسانی اصولوں کے لیے سب سے کڑا امتحان وہی ٹھہرتے ہیں۔ لیکن ایسے ہی حالات میں ان اصولوں کی پاسداری زیادہ ضروری ہو جاتی ہے، کیونکہ یہ اصول ہی سیاست اور جانبداری سے بچتے ہوئے ایسا ماحول پیدا کرتے ہیں جن میں زندگی بچاتی انسانیت تک رسائی اور ان کی مدد ممکن ہوتی ہے۔ ان اصولوں کی اہمیت اپنی جگہ لیکن قدرتی آفات یا ٹیکنالوجی کے درست کام نہ کرنے سے آنے والی تباہی میں امدادی کارکنان کو اتنے شدید سیاسی دباؤ کا سامنا نہیں ہوتا۔

تنازعات کے دوران طبّی اور انسانی خدمت کے عملے اور رضاکاروں پر براہِ راست حملے ان مسائل کی سنگین ترین شکل ہے، لیکن ان کے ساتھ ساتھ انہیں روزانہ کی بنیاد پر کئی طرح کے دیگر خدشات اور تفکرات کا سامنا بھی ہوتا ہے۔ تنازعات کے فریق انسانی خدمت

کی سرگرمیوں کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور ایسے امور بھی جو بین الاقوامی قانون برائے تکریمِ انسانیت کے تحت ان کے فرائض میں شامل ہیں، انہیں بھی سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ دل و دماغ جیتنے کی ریاستی حکمتِ عملی کے تحت کیے جانے والے اقدامات اور غیر وابستگی و غیر جانبداری کی بنیاد پر کی جانے والے بے لوث انسانی خدمت کی حدود کا غیر نمایاں ہو جانا ایک خطرناک صورتِ حال ہے، جس میں مقامی آبادی اور حریف گروہوں کے لیے اعتبار کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ اس سب کے نتیجے میں جنگ شدید تر ہو جاتی ہے، متاثرین کی تعداد بڑھ جاتی ہے اور انسانی خدمت میں مصروف کرداروں کے لیے مصیبت زدہ افراد تک پہنچنا مزید مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی جگہ حریف گروہوں تک انسانی بنیاد پر امداد پہنچانے کو جرم سمجھا جانے لگے تو غیر وابستہ اور غیر جانبدار انسانی خدمت کی گنجائش مزید کم ہو جاتی ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مسلح تصادم یا تشدد کی دوسری صورتوں میں ریاستیں اور غیر ریاستی عناصر غیر وابستگی اور غیر جانبداری کی بنیاد پر انسانی خدمت کے لیے مختلف طرح کے مسائل کا باعث بن جاتی ہیں۔ حالیہ عرصے میں دہشت گردی کے خلاف بنائے جانے والے مختلف قوانین اور عمومی ماحول نے ان مسائل میں اضافہ کیا ہے۔

منقسم دنیا میں عالمگیریت؟

موجودہ دنیا میں انسانی خدمت کے لیے سب سے پہلے جس حقیقت کا سامنا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ مصیبت سرحدوں کی پابند نہیں ہوتی، اور یہ کہ تکلیف اور آزمائش میں مدد کیے جانے کا حق بھی تمام انسانوں کے لیے یکساں ہے۔ لوگ تو علاقے، زبان، رنگ، مذہب، نسل یا حالات کے اعتبار سے یقیناً مختلف ہوتے ہیں لیکن انسانی فطرت ہر جگہ ایک سی رہتی ہے اور

انسانوں کو درپیش دکھوں سے زیادہ کوئی چیز عام نہیں ہے۔ مصائب سب کو لاحق ہوتے اور تکلیف دیتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ مالی مدد، عملی تعاون اور تحفظ فراہم کرنے کا جذبہ ہر ایک ثقافت کا بنیادی حصہ ہے، ان اصولوں کو بلا تفریق و امتیاز ہر ایک پر نافذ کرنے کی سوچ کو ہمیشہ ہی چیلنج کیا جاتا رہا ہے۔ یہ بھی سمجھا جاتا ہے کہ تحریک کے بنیادی اصول دراصل مغربی اقدار کے عکاس ہیں، اور یہ خدشہ موجود ہے کہ انہیں نوآبادیاتی قبضے ختم ہو جانے کے بعد مقامی ثقافتوں اور مذاہب کے مقابلے میں ایک نئے انداز میں تسلط و بالادستی قائم رکھنے، اور جن ممالک میں ان کا اطلاق کیا جا رہا ہو ان کی خود مختاری اور حاکمیت اعلیٰ کو ٹھیس پہنچانے، کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

اس تاثر کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ انسانی خدمت کے اس 'دھندے' کی بنیاد مغرب میں رکھی گئی اور انیسویں صدی میں اس وقت رکھی گئی جب مغرب دنیا بھر میں اپنا قبضہ پھیلا رہا تھا۔ گو امدادِ باہمی اور انسانی خدمت کا رجحان مقامی بنیادوں پر تمام ہی معاشروں میں موجود تھا لیکن یہ درست ہے کہ بین الاقوامی امدادی تنظیم کو ایک باقاعدہ شکل دینے کا وقت اور مقام تو وہی تھا جو بیان کیا جاتا ہے۔ آج بھی متعدد رفاہی و فلاحی تنظیمیں اور ادارے ایسے ہیں جن پر یورپ یا امریکہ کی چھاپ نمایاں ہے۔ اس لیے اس بات کا امکان بھی موجود ہے کہ تکریمِ انسانیت کے بنیادی اصولوں کی ذیل میں کچھ سیاسی یا اقتصادی اہداف بھی موجود ہوں۔ مغرب پر یہ الزام تو ہمیشہ سے ہی موجود رہا ہے کہ جمہوریت اور انسانی حقوق کو دنیا بھر میں نافذ کرنے کی مہم کے دوران دراصل اس نے اپنے لیے سیاسی و مالی فوائد سمیٹے ہیں۔

انسانی خدمت کے شعبے میں اگر کوئی اور ملک یا معاشرہ بھی نمایاں طور پر سامنے آتا ہے تو یہ امکان خاصا نمایاں ہے کہ اسے بھی ایسے ہی الزامات و شبہات کا سامنا کرنا پڑے گا۔[7]

دنیا بھر میں انسانی خدمت کا عزم لے کر اٹھنے والی تنظیموں میں اضافہ اور ترقی دیکھنے میں آ رہی ہے۔ ایسے میں یہ بہت ضروری ہے کہ اس نسبت سے مختلف نقطہ ہائے نظر کو سمجھا جائے، بالخصوص وہ جن کی بنیاد کسی عقیدے پر ہے۔ تکریمِ انسانیت کے اصولوں سے متعلق اسلام کی بنیاد پر پیش کیے جانے والے موقف کو سمجھنے کے ساتھ ان کاوشوں کی تفہیم بھی اہم ہے جن کا مقصد مسلم فلاحی، رفاہی و امدادی اداروں اور تنظیموں کے لیے ایک ضابطۂ عمل کی تیاری ہے۔ ایسی کاوشوں کا محرک یہ احساس ہے کہ انسانی خدمت کا موجودہ ڈھانچہ دراصل مغرب کی دین ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایسے میں مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں سے تعلق رکھنے والے انسانیت کے خدمت گاروں کا باہم مکالمہ بے حد ضروری ہو جاتا ہے تاکہ ان اصولوں سے متعلق تعبیر کو زیادہ سے زیادہ ہم آہنگ کیا جا سکے۔ ان اصولوں کی خالص سیکولر بنیادوں پر کی جانے والی تعبیر اور مقاصدِ شریعت کی بنیاد پر استوار تصوّر کے باہم مطالعہ سے یہ معلوم ہو گا کہ مذہب کی بنیاد پر انسانی خدمت، بالخصوص اسلامی معاشروں میں، کس قدر قابلِ عمل اور تحریک کے بنیادی اصولوں سے کس قدر ہم آہنگ ہے۔ نیز یہ کہ کیا کسی تصادم کی صورت میں غیر وابستگی کو برقرار رکھنا ممکن ہے؟

---

[7] مثال کے طور پر دیکھیے:

Andrea Binder, "The Shape and Sustainability of Turkey's Booming Humanitarian Assistance," *International Development Policy* 5, no. 2 (2014), http://poldev.revues.org/1741; David Shinn, "Turkey's Engagement in Sub-Saharan Africa: Shifting Alliances and Strategic Diversification," Chatham House, 2015, www.chathamhouse.org/publication/turkeys-engagement-sub-saharan-africa-shifting-alliances-and-strategic-diversification.

اس تمام سرگرمی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ بالعموم عطیات دینے اور وصول کرنے والوں کا باہم تعلق بہت ہی غیر متوازن ہوتا ہے، یہاں تک کہ کئی صورتوں میں عطیہ و امداد باہم تناؤ کا باعث بھی بن جاتا ہے، بالعموم اس وقت جب دینے والا اپنی برتری جتانے لگے یا اپنی بالاتر حیثیت کا ناجائز فائدہ اٹھانے لگے۔ اس صورتِ حال کا علاج بھی انسانیت کے اصول کی بہتر تفہیم اور اس پر عمل ہے، جس کی بنیاد احترامِ آدمیت ہے۔ اگرچہ انسانیت کے اصول کو مانتے تو سب ہی ہیں لیکن اس کے عملی اطلاق میں بھی اختلاف کی کئی صورتیں پیش آجاتی ہیں۔

انہی میں سے ایک یہ ہے کہ انتہا پسندانہ رجحانات کے نتیجے میں نہ صرف دیگر بنیادی اصولوں کو نظر انداز کیا جاسکتا ہے، بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ تشدد پسند مسلح گروہ انسانیت کے بنیادی اصول کو ماننے سے بھی انکار کر دیں۔ انسانی خدمت میں مصروف افراد کو یرغمال بنالینا اور ان پر براہِ راست حملے اس حالیہ پر تشدد ماحول کا حصہ ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس اندازِ فکر اور ایسی سرگرمیوں کی بنیاد مذہب و نظریئے اور بنیادی اصولوں کی کوئی تفریق یا اختلاف نہیں ہے۔ اس کے برعکس مذہبی رہنما ایسی سرگرمیوں کو ہمیشہ ناپسندیدہ ہی قرار دیتے رہے ہیں۔[8] ایسی کارروائیوں سے ان اصولوں کو نقصان نہیں پہنچتا بلکہ یہ ضرورت زیادہ اجاگر ہوتی ہے کہ ان کی پاسداری کس قدر اہم ہے۔

[8] مثال کے طور پر ۲۰۱۴ء میں داعش کے سربراہ ابو بکر البغدادی کے نام ایک کھلے خط میں مختلف مکاتبِ فکر سے تعلق رکھنے والے علما نے یہ وضاحت کی تھی کہ انسانیت کے بنیادی اصول دینِ فطرت یعنی اسلام کا لازم جزو ہیں۔ اسی کے مظہر کے طور پر انہوں نے اپنے مخاطب کو یاد دلایا کہ اسلام میں سفیروں، نمائندوں اور ایلچیوں کے قتل کی ممانعت سے یہ لازم آتا ہے کہ صحافیوں اور امدادی کارکنان کے قتل کی بھی اجازت نہیں ہے۔ دیکھیے: www.lettertobaghdadi.com

بہر حال بنیادی نکتہ یہ ہے کہ مذہبی اور سیکولر حلقے ان اصولوں کی عالمگیریت اور اہمیت سے متعلق نئے سرے سے باہم مکالمہ شروع کریں، جس میں مختلف ثقافتوں، مذاہب اور ریاستوں کی تعبیر و تفہیم کی بنیاد پر بات چیت ہو۔

کیا بدلتی دنیا میں یہ اصول بھی تحلیل ہو جائیں گے؟

حالیہ برسوں میں جب ایک طرف انسانی خدمات کے شعبے میں مسلسل وسعت اور تنوع آیا اور دوسری طرف بین الاقوامی سطح پر انسانی خدمات کی طلب اور توقع بھی بڑھ گئی تو ان اصولوں اور ان کی افادیت کے حوالے سے نئے سوالات بھی سامنے آئے ہیں۔ اگرچہ انسانی خدمات میں مصروف شعبے میں ان اصولوں نے عمومی طور پر قبولیت پائی ہے لیکن مختلف پس منظر سے تعلق رکھنے والے افراد اور اداروں کی تعبیرات میں واضح فرق کا امکان بھی بڑھا ہے۔ تحریک کے وابستگان اگر بنیادی اصولوں پر یکسو بھی ہیں تو یہ بہر حال ممکن ہے کہ دیگر ادارے کوئی دوسرے اصول اپنالیں یا انہی اصولوں کی تشریح مختلف انداز میں کرنے لگیں۔

بعض ادارے ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کا دعویٰ تو یہ ہو کہ ان کی سرگرمیاں ان اصولوں کی پابندی پر مبنی ہیں لیکن حقیقت میں وہ ایسا کر نہ پاتے ہوں، یا کرنا ہی نہ چاہتے ہوں۔ مثال کے طور پر جب کسی تنظیم کی رفاہی و امدادی سرگرمی کا بنیادی محرک کسی سیاسی، نسلی یا مذہبی بنیاد پر ایک خاص گروہ سے یکجہتی کا جذبہ ہو تو یہ عین ممکن ہے کہ اس تنازع کا مخالف حریف اسے اپنا مخالف سمجھنے لگے۔ ایسے شبہات پیدا ہو جانے سے ان اصولوں کی پابند تمام تنظیمیں اور تحریکیں مشکوک ٹھہر سکتی ہیں۔

انسانی خدمت کی تنظیموں کے ساتھ ساتھ جہاں ان اصولوں کی تعبیرات میں اضافہ ہو رہا ہے، وہاں ان تنظیموں کی سرگرمیاں اور اہداف بھی اب محض کسی بحران کے اثرات سے نمٹنے تک محدود نہیں، بلکہ وہ اب یہ کوشش بھی کر رہی ہیں کہ آگے بڑھ کر ممکنہ بحران کے اسباب کو بھی کم از کم کیا جائے۔ ایسی صورت میں انسانی خدمت کی تنظیمیں بین الاقوامی برادری کے تبدیل ہوتے ایجنڈے کے مطابق اپنی ترجیحات اور سرگرمیاں طے کرتی ہیں۔ اقوامِ متحدہ کا تیار کردہ یک جان نظام العمل امن برقرار رکھنے کے کلاسیکی تصور سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ عالمی سطح پر ایسے منصوبے کی شکل اختیار کر گیا جس میں انحراف کی روک تھام، نگرانی، استحکام، قانون کی عمل داری، ترقیاتی سرگرمیاں اور انسانی خدمت سب شامل ہیں۔ بہت سی تنظیمیں خود کو اس وسیع تر ایجنڈہ سے ہم آہنگ کر چکی ہیں۔ کسی تنازع کی شکل میں ایسا جامع ردّ عمل جس میں سیاسی، سماجی، معاشی اور انسانی اہداف جمع ہو جائیں، دراصل عطیات دینے والوں کی ترجیح ہوتی ہے۔ حکومت کے تمام شعبوں پر اثر انداز ہونے کی سوچ کے اس انداز کے بارے میں بار بار یہ نکتہ سامنے آتا ہے[9] کہ ان کے ذریعے اقدار اور طریقوں کا ایک مختلف نظام پروان چڑھایا جاتا ہے جو انسانی خدمت کی اخلاقیات کی حدود سے متجاوز ہیں۔[10]

---

[9] مثال کے طور پر دیکھیے:

Organization for Economic Cooperation and Development, "Whole of Government Approaches to Fragile States," DAC Guidelines and Reference Series, 2006, www.oecd.org/dac/governance-peace/ conflictfragilityandresilience/docs/ s37826256.pdf.

[10] Hugo Slim and Miriam Bradley, "Principled Humanitarian Action and Ethical Tensions in Multi-Mandate Organizations in Armed Conflict," *World Vision*, March 2013, www.alnap.org/ resource/9794.

باب ۴

اسلام میں اصول و معیارات برائے تکریمِ انسانیت

یہ سوال کہ کیا موجودہ عالمی قوانین اور اسلامی قانون ایک ساتھ چل سکتے ہیں یا یہ دونوں لازمی طور پر ایک دوسرے کے مقابل اور متبادل ہی ہو سکتے ہیں، بار بار اٹھایا جاتا رہا ہے۔ اس بحث میں یہ بات پہلے سے تسلیم شدہ ہے کہ موجودہ عالمی نظام اور قانون مغربی تہذیب کے ارتقائی سفر کا ثمر ہے جب کہ اسلام ایک بالکل جداگانہ تہذیب ہے۔ اس اعتراف کے باوجود پیش کردہ سوال کے جواب میں کئی اہلِ علم کا کہنا یہ ہے کہ بین الاقوامی قانون برائے تکریمِ انسانیت کے بنیادی اصول و احکام یورپ اور مسلمانوں سمیت غیر یورپی اقوام میں یکساں ہیں۔ اسلام اور مغرب کے تناظر میں بات کرتے ہوئے جنیوا معاہدات کے ساتھ اسلام کے جنگی قوانین، عرف اور روایات کو پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے چند ذیلی اور فروعی امور کے علاوہ دونوں مجموعہ ہائے قوانین یکساں ہیں، جس کی بنیاد مشترک انسانی اخلاقیات ہیں۔

اگرچہ یہ موقف کئی حوالوں سے اور بڑی حد تک درست ہے لیکن معاملے کی ایسی تشریح میں ایک بڑی خامی یہ ہے کہ ان میں دو مختلف روایتوں، یعنی اسلام اور مغرب، کے صرف باطنی مظاہر کو ہی دیکھا جاتا ہے، جیسے یہ چند جامد اور یک رُخے افعال ہیں جن سے متعلق امور و احکام کے ایک دوسرے سے باہم موازنے سے کوئی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ پھر

اس میں ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ اس طرزِ فکر کے نتیجے میں ایک خاص اندازِ فکر دیگر تمام پر حاوی ہو جاتا ہے اور انسانیت کے لیے ایک دوسرے کے استفادہ کے مواقع ناپید ہو جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلامی اور مغربی فکر میں سے ہر ایک کے پیچھے عمیق قانونی روایات، مخصوص زاویۂ نگاہ، اندازِ فکر اور طرزِ عمل کار فرما ہے۔ پھر ان دونوں روایات کے درمیان صدیوں کا تعامل ہے جو حال میں ان کی سوچ اور رویئے کی تشکیل میں جھلکتا ہے۔ ان تجزیات میں بالعموم ایک بڑا مسئلہ یہ رہا ہے کہ ان میں مغربی نظام کو معیار تسلیم کر لیا جاتا ہے پھر اسلام کے وضع کردہ نظام کو اس کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے، اور بیشتر صورتوں میں موازنے کا مقصد ہی یہ ثابت کرنا ہوتا ہے کہ اسلام بھی دراصل وہی چاہتا ہے جس کی ترویج مغرب کے عطا کردہ موجودہ نظام کی خواہش ہے۔

اس طرزِ تحقیق سے ہٹتے ہوئے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کی بین الاقوامی تحریک کی بنیادوں، اس کے ارتقاء، مسلم اقوام سے اس کے تعامل کے اہم پہلوؤں اور تکریمِ انسانیت کے حوالے سے اس کے وضع کردہ اصولوں کو پیش کرنے کے بعد اسلام کے نظام اور اصولوں کو الگ سے بیان کیا جائے۔ تاہم اس مختصر حصے میں موضوع کے تمام پہلوؤں کا احاطہ ممکن نہیں ہے اور صرف چند اہم امور کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اس مجموعہ کے تناظر میں اسے اچھی طرح سمجھا جا سکے۔

اسلام کا نظامِ زندگی

اسلام جو نظامِ حیات تشکیل دیتا ہے، اس کی بنیاد پانچ چیزوں پر ہے۔ (الف) اس بات کی شہادت دینا کہ صرف اللہ ہی اکیلا معبود و مالک ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں، (ب) نماز قائم کرنا، (ج) زکاۃ ادا کرنا، (د) استطاعت کی صورت میں بیت اللہ کا حج کرنا، اور (ہ) رمضان کے روزے رکھنا۔ ان میں سے ہر ایک عمل صرف مذہبی رسومات کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ اسلام کے نظام کو قائم کرنے اور اس پر عمل پیرا رہنے کے لیے ایک مکمل نظامِ فکر اور عمل ہے۔ تاہم یہاں اس تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ ان پانچوں امور کی حیثیت چونکہ بنیاد کی سی ہے، اس لیے ان میں سے ہر ایک کا تعلق جہاں انسان اور خالق کے باہم ربط سے ہے، وہاں ان میں انسانوں کے مابین اور دیگر مخلوقات سے ان کے تعامل کی بنیادیں بھی موجود ہیں۔ مجموعی طور پر ایمان اور عبادات کا یہ مجموعہ اخلاقیات کا ایسا نظام ترتیب دیتا ہے جس میں سماجی ربط اور غم گساری اہم ترین عناصر میں سے ہیں۔ اس نظام میں اگرچہ فرد کی فلاح اصل مقصود ہے، لیکن اس کے لیے تشکیل کردہ نظام اجتماعیت پر مشتمل ہے۔ انسانی اختیار و انتخاب کو ان خدائی ہدایات کے تابع کر دیا گیا ہے جو قرآن اور سنت میں موجود ہیں۔ اس نظام میں انسان کے طرزِ عمل کو محض قوانین اور معاشرتی روایات کے تحت منضبط نہیں کیا جاتا بلکہ خیر اور بھلائی کے لیے اس کی فطرت کو ابھارا جاتا ہے۔ یہ تصور کہ وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے جو ہر وقت اس کی نگرانی کر رہا ہے، اور یہ کہ وہ اپنے ہر قول و فعل کے لیے اس کائنات کے حقیقی مالک کے سامنے جواب دہ ہے، اسے نہ صرف از خود خیر اور بھلائی پر ابھارتا ہے بلکہ اسے دنیا میں کسی اجر سے بے نیاز کر کے صرف اللہ کی رضا کا امیدوار بنا دیتا ہے۔

تکریمِ انسانیت کے اسلامی اصول

اگرچہ تکریمِ انسانیت اسلام کے پورے نظام کا ایک اہم تقاضا اور ہدف ہے لیکن جس تناظر میں ہم بات کر رہے ہیں، اس میں مندرجہ ذیل کو تکریمِ انسانیت کے اسلامی اصول قرار دیا جاسکتا ہے۔

- توحید
- خلافت
- فطرت
- عدل
- سلام
- عفوودر گزر
- صبر
- خیر اور احسان

یہ سب تصورات باہم پیوست ہیں اس لیے ان کی ترتیب اور تشکیل اس سے مختلف بھی ہو سکتی ہے۔ نیز یہ بھی واضح ہے کہ ان اصولوں میں سے بنیادی اور عملی اصولوں کو الگ الگ بیان کرنے اور تکریمِ انسانیت پر مبنی بچاؤ، امداد، اور بحالی کی سرگرمیوں کے تناظر میں انہیں ترتیب دینے اور ان کی تشریح کرنے کا کام ابھی بالکل ابتدائی مراحل میں ہی ہے۔ تاہم یہ طے ہے کہ ان میں سے پہلا نکتہ یعنی توحید ان سب کی اصل ہونے کی وجہ سے ہمیشہ اولین ہی رہے گا۔ ان میں سے ہر ایک تصور کی مختصر تشریح ذیل میں دی جارہی ہے۔

توحید

توحید یعنی اس بات کا اقرار کہ اللہ اس کائنات کا تنہا خالق اور مالک ہے، وہی اس کا نظام چلا رہا ہے، اسلام کے عقائد، اخلاقیات اور نظام کی جڑ ہے۔ توحید پر ایمان کا مطلب یہ ماننا بھی ہے

کہ تمام مخلوقات کی اصل ایک ہے یعنی یہ سب کے سب ایک حکمت بھرے منصوبے کے تحت ایک ہی خالق کی تخلیق ہیں۔ انسان ان تمام مخلوقات میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ابتدا ایک مرد و عورت کے جوڑے سے کی۔ اللہ تعالیٰ اپنی بے پناہ قدرت سے ہر انسان کے کھلے اور چھپے تمام امور کا نگران ہے اور ہر وقت ہر معاملے میں اس کا ہی حکم چل رہا ہے۔ اگرچہ دنیا میں بھی انسانی اعمال کا نتیجہ مرتب ہوتا ہے لیکن ان کا اصل بدلہ موت کے بعد کی زندگی میں دیا جائے گا۔ اس طرح کسی بھلائی کے بدلے میں اجر کی امید اور کسی ظلم یا ناانصافی کی صورت میں عذاب کا خوف بھی صرف ایک ہی ہستی سے منسوب ہونے کی وجہ سے انسان کی زندگی سے خود غرضی، دولت کی ہوس، ظلم اور زیادتی دور ہو جاتی ہے اور وہ ان لوگوں کے ساتھ بھی بھلائی پر آمادہ رہتا ہے جن سے اسے بدلے میں کسی بھلائی کی امید اور توقع نہیں ہوتی۔ توحید پر ایمان انسان کو اس قدر بلند کر دیتا ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی کے سامنے سر نہیں جھکاتا اور حق کے اتباع میں اس کے علاوہ کسی کا خوف نہیں رکھتا۔

توحید کے پیدا کردہ اسی تصور کی وجہ سے انسان یہ سمجھنے کے قابل ہوتا ہے کہ انسان کی اچھائی یا برائی کا معیار اس کے رنگ، نسل، زبان، علاقے یا کوئی ایسا عنصر نہیں ہے جس کا تعین دراصل اللہ نے بطور خالق کیا ہے بلکہ اس کی فوقیت ان بنیادوں پر ہو گی جو اس نے خود اپنے لیے اپنائے ہیں جیسے عقائد اور اخلاق۔

خلافت

یہ جاننے کے بعد کہ اس دنیا میں اقتدارِ اعلیٰ کس کو حاصل ہے، انسان کی فکر و عمل کو ترتیب دینے میں اس بات کا تعین بہت اہمیت رکھتا ہے کہ خود انسان کی اس دنیا میں حیثیت کیا ہے

اور اس کا تعلق خود اس مقتدرِ اعلیٰ اور دیگر مخلوقات سے کیا ہے۔ اس حوالے سے اسلام کی رہنمائی یہ ہے کہ اللہ نے تمام تر کائنات تخلیق کرنے کے بعد انسان کو زمین پر اپنے خلیفہ کے طور پر پیدا کیا اور اس کی تخلیق کے فوراً بعد اپنی انتہائی تابع فرمان اور پاکیزہ مخلوق یعنی فرشتوں کو اس کے سامنے سرنگوں کر کے انسان کی عظمت اور سربلندی کو ہمیشہ کے لیے طے کر دیا۔ انسان کے اس مقام کو اللہ نے یوں بیان فرمایا:

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا

اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواری دی، اور پاکیزہ روزی عطا کی، اور بہت سی مخلوقات پر فضیلت دی۔

(الاسراء: ۷۰)

خلافت کے اس منصب کے تحت انسان کو ایک امانت کے طور پر کچھ اختیار سونپا گیا ہے اور اسے یہ ذمہ داری دی گئی کہ وہ اس دنیا کا انتظام بہتر انداز میں کرے اور ہر ایک کی بھلائی کے لیے خیر خواہی سے کوشش کرے۔ گویا توحید اور خلافت کے یہ تصورات انسان میں عمومی ذمہ داری کا ایک ایسا احساس پیدا کرتے ہیں جن کے تحت کیا گیا ہر عمل اسے اپنے خالق کی نگاہ میں زیادہ پسندیدہ بناتا ہے اور جس سے غفلت اسے اپنے ربّ کی رحمت سے دُور کر سکتی ہے۔ تاہم اسلام اخلاقیات کے اس پختہ نظام کے ساتھ ساتھ عملی میدان میں برابری، انصاف اور شفافیت کی بنیاد پر قانونی ڈھانچہ بھی ترتیب دیتا ہے۔ انسان کو دی گئی اسی تکریم کا ایک مظہر یہ ہے کہ اہلِ ثروت کو یہ بتایا گیا ہے کہ ان کے مال میں غریب اور نادار افراد کا حق مقرر کیا گیا ہے، اس لیے اگر وہ کسی کو کچھ ادا کر رہے ہیں تو وہ اس پر احسان نہیں کر

رہے بلکہ اس کا حق اس تک پہنچا کر اپنا فرض ادا کر رہے ہیں۔ عزتِ نفس کے اس تحفظ کے ساتھ انسانی تکریم کو یقینی بنانے کے لیے اسلامی نظامِ معاشرت و معیشت کا ایک بڑا ہدف یہ ہے کہ انسان انسانوں کے محتاج نہ رہیں۔ اسی لیے غریب اور نادار کی فوری اور ہنگامی مدد سے زیادہ اس بات کو ہدف بنایا جاتا ہے کہ ہر فرد اپنے قدموں پر خود کھڑا ہونے کے قابل ہو۔ اسلام کے پیش کردہ تصورِ خدمت کی ایک بڑی مثال حدیث میں اس صورت میں آتی ہے جب رسول اللہ ﷺ نے ایک انتہائی نادار اور مجبور شخص کی طرف سے مدد کے مطالبے پر اسے محض کھانا دینے کی بجائے روزی کمانے کا اسباب مہیا کر دیا تاکہ وہ معاشرے میں عزت کی زندگی حاصل کر سکے۔

فطرت

فطرت سے مراد یہ ہے کہ بنیادی طور پر ہر انسان میں خیر کا مادہ اور خیر کی طلب رکھی گئی ہے۔ اسی بنیاد پر ہر انسان اس لائق ہے کہ اس کی جان، مال اور عزت کا احترام کیا جائے۔ انسانی جان کی اسی بنیادی حرمت کو نمایاں کرتے ہوئے قرآن کا یہ فیصلہ ہے کہ جو کوئی کسی کو قتل کرے، جب کہ یہ قتل نہ کسی اور جان کا بدلہ لینے کے لیے ہو اور نہ کسی کے زمین میں فساد پھیلانے کی وجہ سے ہو، تو یہ ایسا ہی ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا، اور جس نے کسی ایک شخص کی جان بچائی تو یہ ایسے ہی ہے جیسے اس نے تمام انسانوں کی جان بچائی۔ (المائدۃ: ۳۲)

گویا اسلام کے دیئے گئے تصور کے مطابق تمام انسان واجب الاحترام ہیں اور اسے بحیثیتِ انسان عزت و تکریم سے نوازا گیا ہے۔ یہی تصور اسلام میں انسانوں کی مساوات کی تشریح بھی کرتا ہے، اور یہ وضاحت کرتا ہے کہ ہر انسان میں ہر وقت خیر اور صلاح کا امکان

موجود رہتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں اسی اصول کو اس طرح بیان فرمایا:

''اے لوگو سنو! یاد رکھو تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے (یعنی آدمؑ)۔ کسی عربی کو عجمی پر، کسی عجمی کو عربی پر، کسی گورے کو سیاہ فام پر اور کسی سیاہ فام کو گورے پر برتری حاصل نہیں ہے، سوائے تقویٰ کی بنیاد کے''۔
(مسند احمد: ۲۳۷۹)

عدل

عدل کا عمومی مفہوم ہر چیز کو اس کا مناسب مقام دینا ہے، اس طرح عدل اسلام کے عطا کردہ نظام میں ایک بنیادی قدر اور اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ بالخصوص اسلام کا قانونی ڈھانچہ تو اسی پر استوار ہے۔ اس کی اہمیت اس قدر ہے کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی ایک صفت قرار دیا ہے، وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ زمین کے مختلف خطوں میں پے در پے بھیجے گئے انبیاء اور رسولوں کا مقصد بھی دراصل یہی تھا کہ دنیا میں عدل کا بول بالا کیا جائے۔ (الحدید: ۲۵) یہی وجہ ہے کہ اسلام کی پیروی کرنے والوں کے لیے یہ اللہ کا حکم ہے کہ وہ نہ صرف خود عدل سے کام لیں بلکہ عدل کے قیام میں مددگار ہوں، چاہے اس کی زد خود ان پر یا ان کے کسی قریب ترین رشتے پر ہی پڑتی ہو۔ لہٰذا ارشاد ہے:

''اے ایمان والو، انصاف پر مضبوطی سے قائم رہو اور اللہ کے واسطے گواہ بنو چاہے اس انصاف یا گواہی کی زد خود تم پر، تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ فریقِ معاملہ چاہے مال دار ہو یا غریب، اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہشات کی پیروی میں حق سے مت ہٹو۔ اور اگر

تم نے کج بیانی کی یا پہلو تہی کی تو جان لو کہ جو کچھ تم کرو گے، اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔" (النساء: ۱۳۵)

عدل اور انصاف پر خود قائم رہنے اور معاشرے میں ہونے والے تمام فیصلوں اور اقدامات میں عدل کو یقینی بنانے کے لیے انسان کو غیر جانبداری اور غیر وابستگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رضاکارانہ طور پر آگے بڑھنے کا یہ حکم ایک مختلف قسم کا کردار پیدا کرتا ہے، جس کا اوّلین اور واحد مقصد اللہ کی رضا کا حصول ہوتا ہے۔ عدل کا یہ تصور قانونی و انتظامی امور تک محدود نہیں بلکہ یہ زندگی گزارنے کا سلیقہ اور بنیادی اصول ہے۔ اسی لیے "اللہ عدل، احسان اور قرابت داروں پر خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی، بدی اور ظلم سے روکتا ہے"۔ (النحل: ۹۰)

سلام

سلام بھی ایک وسیع تر مفہوم کا حامل لفظ ہے جس کا مطلب عمومی سلامتی اور امن کا ہے۔ سلام اور اسلام دونوں کا مصدر 'س ل م' ہے اور دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم اور ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ نے اپنے صفاتی ناموں میں السلام کو شامل کر کے یہ تصور دیا ہے کہ وہ امن کو پسند فرماتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ اس کے بتائے ہوئے طریقوں کے مطابق انسانیت امن کو حاصل کر لے۔ قرآنِ مجید میں ۷۶ مقامات ایسے ہیں جہاں سلامتی اور امن کو ایک نعمت اور مقصد کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ زمین پر سلامتی و امن کا قیام اسلام کے مقاصد اور اہداف میں سے ہے۔ اسی لیے اسلام پر عمل کا نتیجہ سلام بتایا گیا ہے: "اس (قرآن) کے ذریعے اللہ ان لوگوں کو سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے جو اس کی خوش نودی کے

طالب ہیں، اور انہیں اپنے حکم سے اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے، انہیں سیدھے راستے کی ہدایت عطا فرماتا ہے۔" (المائدۃ: ۱۶)

مسلمانوں کو یہ سکھایا گیا ہے کہ جب ان کا باہم ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہو، یا کسی بھی وسیلے سے باہم رابطہ ہو تو ان میں سے ہر ایک کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ السلام علیکم کہہ کر دوسرے کو اپنی جانب سے سلامتی اور امن کا پیغام دے۔ اس کی تلقین اس قدر ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "تم اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک تم مومن نہیں بن جاتے، اور تم اس وقت تک مومن نہیں بن سکتے جب تک باہم محبت نہ کرنے لگ جاؤ، تو کیا میں تمہیں ایک ایسی چیز نہ بتاؤں جس سے تم آپس میں محبت کرنے لگو گے؟ آپس میں سلام کو عام کرو" (مشکوۃ المصابیح: ۴۶۳۱)۔ اس شخص کو بہتر مسلم قرار دیا گیا ہے جس کے قول اور فعل سے دیگر مسلمان محفوظ رہیں۔ (صحیح البخاری: ۱۰)

کسی مسلح تصادم اور تنازع کی صورت میں مسلمانوں کو حکم ہے کہ امن کے لیے جیسے ہی کوئی موقع پیدا ہو لپک کر اسے پکڑیں اور جنگ کی صورت میں بھی حتی الامکان زیادتی سے گریز کریں۔ (البقرۃ: ۱۹۰ تا ۱۹۵، الانفال: ۶۱)

سلام کا ہی ایک پہلو انفرادی سطح پر رحم سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایسی صفت ہے جو اس کی تمام صفات میں نمایاں ترین ہے اور جسے اللہ نے خود پر لازم کر رکھا ہے۔ قرآنِ مجید کی تمام صورتوں کے آغاز میں اللہ کے نام کے ساتھ جن دو صفات کی یاد دہانی کروائی جاتی ہے وہ یہی ہیں کہ اللہ بے پناہ اور مسلسل رحم فرمانے والا ہے۔ انسانی اخلاقیات میں بھی رحم کو انتہائی پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا کہ جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا، اللہ بھی اس پر رحم نہیں فرماتا۔ (صحیح البخاری: ۷۳۷۶)

عفو و در گزر

عفو یعنی معاف کر دینا رحم ہی کا ایک پہلو ہے اور اس کا تعلق سلام کے تصور سے بھی ہے۔ اسلام دراصل بدلہ لینے کی نسبت معاف کر دینے کو اس لیے پسند فرماتا ہے کہ اس کے نتیجے میں جنگ و جدل کے خاتمے اور امن کے فروغ کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ پھر چونکہ ہر انسان کی فطرت میں بھلائی موجود ہے، اس لیے اس بات کا امکان ہے کہ جسے معاف کیا گیا ہو وہ معاف کر دینے سے نہ صرف مزید جھگڑے سے باز آ جائے بلکہ اس کے اور معاف کر دینے والے کے درمیان تعلقات کی نوعیت ہی تبدیل ہو جائے اور کسی معاملے کے فریق باہم دوست بن جائیں۔ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ: ''نیکی اور بدی برابر نہیں ہوتی۔ برائی کو بھلائی سے دور کرو۔ پھر (تم دیکھو گے کہ) وہ جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی تھی ایسا ہو جائے گا جیسے قریبی دوست۔'' (حم السجدۃ: ۳۴)

حقیقت تو یہ ہے کہ معاف کر دینے اور غلطیوں سے در گزر کر دینے کا حوصلہ اس وقت ملتا ہے جب توحید پر یقین کی بنیاد پر انسان یہ جانتا ہے کہ دنیا کا ہر عمل دراصل اللہ کے ہاں لکھا اور تولا جا رہا ہے اور بالآخر عدل اسی کے ہاں ہو گا، جہاں کسی کو معاف کر دینا ایسی نیکی ہے جس کا اجر بے پناہ ہے۔ ایسے میں جس پر زیادتی کی گئی ہو، اس کا بدلے کا حق تسلیم تو کیا گیا ہے لیکن معاف کر دینے کی خوب حوصلہ افزائی بھی کی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے۔ پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے، اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔'' (الشوریٰ: ۴۰)

صبر

صبر اسلامی اخلاقیات کی ایک اور ایسی صفت ہے جس کا تذکرہ قرآن کی تقریباً دو سو آیات میں ہے۔ صبر کا ایک مطلب تو عفو و درگزر کے ساتھ ملا کر سمجھا جا سکتا ہے، یعنی دوسروں کی طرف سے کی گئی زیادتیوں اور غلطیوں پر بڑے پن کا مظاہرہ کرنا۔ تاہم اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ انسان ہر قسم کے حالات میں ایمان اور بہترین اخلاق پر قائم رہے۔ گویا صبر کے قرآنی مفہوم کو استقامت کے لفظ سے زیادہ بہتر طور پر بیان کیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے انسان ظلم اور زیادتی کو برداشت کرنے لگ جائے بلکہ یہ ہے کہ انسان عدل کی حمایت میں جما رہے، امن کی پاسداری کرے اور رحم کا طرزِ عمل نہ چھوڑے۔ اسی طرح ایسے میں جب انسان کی خیر خواہی، عفو و درگزر اور ہمدردی و رحم کا جواب روکھے پن اور ناشکری سے دیا جا رہا ہو تو بھی اپنے طرزِ عمل پر قائم رہنا صبر ہے۔

خیر اور احسان

خیر ایک عمومی تصور ہے جو اپنے اندر ہر طرح کی بھلائی، نیکی، اچھے اخلاق اور بہترین نتائج کو سموئے ہوئے ہے۔ اس کا عمومی مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے اندر موجود اچھائی کے جذبے کو خدائی ہدایات کے مطابق پروان چڑھائے اور اس سے انحراف سے بچنے کی مسلسل کوشش کرتا رہے۔ اوپر ذکر کردہ تمام افعال اور اخلاق خیر کے اس تصور کا حصہ ہیں لیکن یہ تصور ان سب سے بھی زیادہ جامع تر ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور تصور جو انسان کو مسلسل زیادہ سے زیادہ خیر کی لگن میں لگائے رکھتا ہے، وہ احسان کا تصور ہے جسے انگریزی میں excellence یا perfection سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ گویا یہ ایک ایسا ہدف جو ہمیشہ بہتر سے بہتر کی گنجائش باقی رکھتا ہے۔ یہی وہ محرک ہے جو ایثار کا باعث بنتا ہے، یہاں تک کہ

احسان کا مظاہرہ کرنے والا ضروری ذاتی فائدے پر بھی کسی دوسرے حاجت مند کی ضرورت اور فائدے کو ترجیح دینے لگتا ہے۔ یہ ایثار کسی ظاہری اور وقتی جذبے کے تحت نہیں بلکہ مکمل رضامندی و خوشی سے اور باہم محبت کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ مدینہ کی جانب ہجرت کرنے والے مسلمانوں کی میزبانی کرنے والوں کے ایثار پر مبنی کردار کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح سراہا ہے:

''اور جو لوگ مہاجرین کی آمد سے پہلے ایمان لا کر اس گھر یعنی مدینہ میں مقیم تھے، یہ ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں۔ انہیں جو کچھ بھی دے دیا جائے، یہ اپنے دلوں میں اس کی کوئی حاجت محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، خواہ یہ خود تنگ دست ہی ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے دل کی تنگی سے بچا لیے گئے، وہی فلاح پانے والے ہیں۔'' (الحشر: ۹)

اصولوں کے اطلاق میں توازن اور ترجیح

فقہائے اسلام نے قرآن و سنت کی تعلیمات کو جامعیت سے مطالعہ کر کے یہ کوشش کی ہے کہ شریعت کے اہداف کو چند نکات کی شکل میں مرتب کیا جا سکے تاکہ یہ انسانی زندگی کے جملہ معاملات میں توازن اور ترجیح قائم کرنے میں مدد کر سکیں۔ اس طرح سے بیان کردہ مقاصدِ شریعت میں پانچ اہداف معروف ترین ہیں۔ یہ پانچ مقاصد ''دین کا تحفظ، جان کا تحفظ، مال کا تحفظ، عقل کا تحفظ اور نسل کا تحفظ ہیں۔ اسلام دراصل ایک ایسا ماحول پروان چڑھانا چاہتا ہے جس میں ہر فرد کو روحانی، اخلاقی، سماجی و اقتصادی ترقی کے مواقع حاصل ہوں۔ کسی بھی صورتِ حال میں توازن اور ترجیح کے تعین میں مقاصدِ شریعت کے حصول کے لیے ایک اہم عنصر مصلحت ہے، جسے فقہا منفعت کے حصول اور ضرر سے تحفظ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اسی لیے امام غزالی یہ کہتے ہیں کہ شریعت کا مقصد تمام انسانوں کی فلاح

ہے جو دین، نفس، عقل، نسل اور مال کی حفاظت میں مضمر ہے۔ جو چیز بھی ان پانچ عام ضروریات کا تحفظ کرتی ہو وہ مطلوب ہے اور جس چیز سے بھی یہ تحفظ زائل ہوتا ہو وہ فساد انگیز ہے اور اس سے بچنا لازم ہے۔[1] ان اہداف کو انسانی زندگی کی جامع تشکیل کے عناصر کے طور پر بھی بیان کیا جاتا ہے۔ یہ تمام مقاصد باہم ایک دوسرے سے متعلق اور پیوست ہیں۔

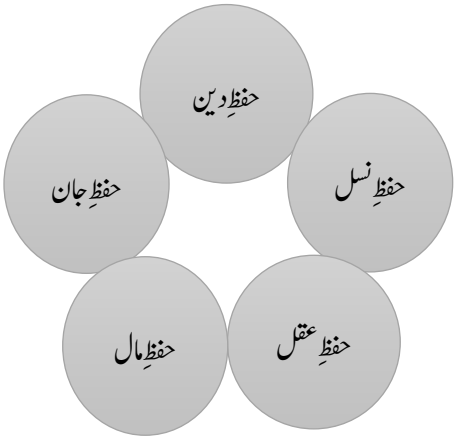

اس کے علاوہ باہم مشاورت اور پہلے سے موجود معاہدات اسلام کے دیئے گئے نظام میں کسی بھی فیصلے کے تعین میں کردار ادا کرتے ہیں۔

[1] مقصود الشرع من الخلق خمسة وهو أن يحفظ عليهم دينهم ونفسهم وعقلهم ونسلهم ومالهم فكل ما يتضمن حفظ هذه الأصول الخمسة فهو مصلحة وكل ما يفوت هذه الأصول فهو مفسدة ودفعها مصلحة ۔ (المستصفى، الغزالى، دار الكتب العلمية، سنة النشر: ۱۴۱۳ھ/۱۹۹۳م، رقم الطبعة: ط ۱، ص: ۱۷۴)

مذہب کی بنیاد پر خدمتِ انسانیت

جب یہ معلوم ہے کہ اسلام انسانوں کے درمیان رنگ، نسل، زبان اور علاقے کی بنیاد پر تفریق نہیں کرتا بلکہ انسانوں میں امتیاز اور عدم امتیاز کی بنیاد تقویٰ یعنی ایمان اور عمل کو قرار دیتا ہے، تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمدردی، رحم، ایثار اور تعاون سمیت اسلامی اخلاقیات سے صرف مسلمانوں کو استفادہ کا حق ہے؟ بظاہر کسی کو ایسا محسوس ہوتا ہو تو بھی حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ یہ سمجھنا مشکل ہو سکتا ہے کہ ایک مسلمان کی ہمدردی اور انسان دوستی ایک غیر مسلم کے لیے بھی اسی طرح موثر ہو گی جیسے ایک مسلمان کے لیے، بالخصوص اس وقت جب مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تنازع کی کیفیت ہو۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں انسان دوستی کی بنیادیں اس سے بہت گہری ہیں جتنی بالعموم سمجھی جاتی ہیں۔

اس مضمون کے تسلسل میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلام میں انسان دوستی کی جڑ توحید کے اقرار میں ہے جو اسلام کا بنیادی عقیدہ ہے۔ یہ جان لینے کے بعد کہ ہر مخلوق کا خالق، مالک، اور پرورش کرنے والا ایک ہی ہے، دیگر مخلوقات اور بالخصوص انسانوں سے ایک خاص قسم کا ربط پیدا ہو جاتا ہے۔ اس ربط کی نوعیت رسول اللہ ﷺ نے اس طرح بیان فرمائی ہے کہ: ''مخلوق ساری کی ساری اللہ کا کنبہ ہے، اس لیے اللہ کو سب سے پیارا وہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ اچھا سلوک رکھے۔'' (طبرانی، المعجم الاوسط: ۵۵۴۱)

اس ربط کو تقویت انسانیت کی تخلیق اور مقصدِ تخلیق سے متعلق یہ تصور دیتا ہے کہ تمام انسان ازلی طور پر ایک فضیلت اور فوقیت رکھتے ہیں اور انہیں اجتماعی و انفرادی طور پر خلافت کا منصب دیا گیا ہے۔ پھر یہ کہ تمام انسان فطری طور پر خلافت کی اس امانت کے حامل ہیں، نیز یہ کہ اچھائی اور برائی کی تمیز عطا کر دینے کے بعد انسان کو اپنی زندگی کے راستے

کا انتخاب بھی خود اللہ تعالیٰ نے یہ دیا ہے۔ یہ تمام تصورات اور عقائد ایک مسلمان کے دل میں ہر ایک کے لیے ہمدردی اور گنجائش پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک مسلمان میں وہ شخصیت پیدا ہوتی ہے جو سراپا عدل، صبر، خیر اور احسان ہوتی ہے۔

پھر مقاصد شریعت کی روشنی میں بھی ہر فرد کو اپنے عقیدے کے انتخاب کا حق حاصل ہے اور اس کی بنیاد پر کسی ضرورت مند کو مدد اور فلاح کی سرگرمیوں سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ پھر کمزوری اور محتاجی میں مبتلا افراد کی بھی جان اور مال اور اولاد کا تحفظ بھی انہی مقاصد کے تحت اسے فراہم کیا جاتا ہے۔ اس طرح کا طرزِ عمل متاثرہ فرد کو کسی ممکنہ پروپیگنڈہ اور پہلے سے تشکیل شدہ خیالات کے برعکس اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں رائے قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اس طرح عقل کے تحفظ کا تقاضا بھی پورا ہوتا ہے۔

اس نکتے کی سب سے زیادہ وضاحت اسلام کے قانونِ جنگ پر نظر ڈالنے سے ہو سکتی ہے۔ اسلام امن اور صلح کو افراتفری اور جنگ پر ترجیح دیتا ہے، اور جنگ یا تصادم کی اجازت بھی صرف اس وقت دیتا ہے جب یہ امن اور آزادی کے لیے ناگزیر ہو۔ ایسے میں بھی اس کا مقصد فریقِ مخالف کو تہہ تیغ اور تباہ و برباد کرنا نہیں ہوتا بلکہ صرف فتنے پر قابو پانا ہوتا ہے۔ اس وقت ہم جس نکتے، یعنی فریقِ مخالف کے لیے مسلمان کی انسان دوستی، پر گفتگو کر رہے ہیں، اس کو سمجھنے کے لیے یہی کافی ہے کہ اسلام خود برسرِ پیکار مجاہدین کو بھی ایک انسان دوست طرزِ عمل کی تلقین کرتا ہے۔ اس حوالے سے دی گئی ہدایات کے مطابق ایک مسلمان جنگ جُو کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ مخالف قوم سے تعلق رکھنے والے افراد کو بلا تفریق قتل کرنا شروع کر دے، ان کی ہتک کرے، عبادت گاہوں کو نقصان پہنچائے، فصلیں اور درخت تاراج کرے، لاشوں کی بے حرمتی کرے، زخمیوں اور جنگ سے

کنارہ کش ہو جانے والوں کو نشانہ بنائے یا جانوروں تک کو بھی بلا ضرورت ذبح کرے۔ جنگ و امن میں سفیروں کا احترام سکھایا گیا ہے، بدعہدی سے باز رہنے کی تاکید کی گئی ہے، جنگ کی صورت میں بھی غیر ضروری طور پر طاقت کے استعمال سے منع کیا گیا ہے، صلح و امن کا موقع پیدا ہوتے ہی اس کو ترجیح دینے کی تعلیم دی گئی ہے، دشمن بھی اگر پناہ طلب کرے تو اسے امن اور حفاظت فراہم کرنا سکھایا گیا ہے اور قیدیوں سے بھلا سلوک کرنے کی عملی تلقین کی گئی ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے اس بات کو زور دے کر کہا ہے جنگ میں ایسے افراد جو عملی طور پر غیر جانبدار ہیں ان کو نشانہ نہ بنایا جائے۔ اس لیے حکم دیا کہ اپنے گھروں میں محصور، خواتین، بچوں، بیماروں، جنگ سے علیحدہ رہنے والے عابد و زاہد افراد وغیرہ سے تعرض نہ کیا جائے۔

اس سے بڑھ کر یہ بات اہم ہے کہ ان ہدایات کو صرف پھیلایا نہیں گیا بلکہ ان کی پاس داری کو یقینی بھی بنایا گیا اور رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرامؓ نے اپنی زندگیوں ہی میں ان کے عملی اطلاق کی ایسی مثالیں قائم کیں جن سے ایک نئے رجحان اور ایک مختلف طرزِ عمل کو فروغ ملا۔ بالخصوص اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کے لیے تو حسنِ سلوک کی مثالیں متعدد ہیں۔ ان میں نمایاں ترین مثال یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ مشرکینِ مکہ نے رسول اللہ ﷺ اور ان پر ایمان لانے والوں کو انتہائی ظلم و ستم کے بعد مکہ سے بے دخل کر دیا تھا، جب مکہ میں قحط آیا تو آپؐ نے اہلِ مکہ کو مالی امداد بھجوائی تاکہ وہ اپنے غربا میں تقسیم کر سکیں۔ یہ کردار یقیناً رحمۃ للعالمین ہی کا ہو سکتا ہے جسے آپؐ پر ایمان لانے والے ہر فرد کے لیے بہترین مثال (اسوہ حسنہ) قرار دیا گیا ہے۔

اپنے سماجی تحفظ کے نظام میں اسلام نے یہ طے کیا ہے کہ صدقات کو جن لوگوں کی مدد کے لیے استعمال کیا جائے گا ان میں غریب، مساکین، زکاۃ کی تقسیم پر مامور افراد، قیدی اور مسافر شامل ہیں۔ ان افراد سے متعلق قرآن ان افراد میں مذہب کی بنیاد پر کسی تفریق کے بغیر ان کی ضرورت کا لحاظ کرتا ہے۔ اسی لیے حضرت عمرؓ نے جب ایک یہودی خاندان کا بیت المال سے مستقل وظیفہ مقرر کرنے کا حکم دیا تو فرمایا ''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ صدقات فقراء اور مساکین کے لیے ہیں اور یہ شخص اہلِ کتاب کے مساکین میں سے ہے۔'' آپؓ اپنے شام کے سفر کے دوران جذام میں مبتلا کچھ عیسائیوں کے پاس سے گزرے تو مسلمانوں کے بیت المال سے ان کی کفالت کا حکم دیا۔ عکرمہ، ابنِ سیرین، زہری اور جابر بن زید ایسے مسلم فقہا میں شامل ہیں جو غیر مسلم شہریوں کو زکاۃ میں سے دینے کو بھی جائز سمجھتے ہیں۔ مایہ ناز فقیہہ شہاب الدین قرافی بھلائی (برّ) کی تشریح کرتے ہوئے ان امور کو بھی ذکر کرتے ہیں: ''کمزور غیر مسلموں سے نرمی کا برتاؤ، ان کے فقیروں کی حاجت روائی، ان کے بھوکوں کو کھانا کھلانا، ان کے بے لباسوں کو لباس پہنانا، ان کے ساتھ لطف و رحمت کی بنیاد پر نہ کہ خوف و ذلت کے باعث نرم کلام ہونا، ان کی ہمسائیگی میں پیش آنے والی کسی تکلیف پر بوجہ نرمی نہ کہ کسی خوف و لالچ کے اور باوجود قوت کے برداشت کرنا، ان کے لیے ہدایت پانے اور اہلِ سعادت میں شامل ہونے کی دعا کرنا، دینی و دنیاوی تمام امور میں ان کی خیر خواہی کرنا، اگر کسی کو ان سے ایذا پہنچے تو ان کی عیب پوشی کرنا، ان کے اموال، عصمتوں، تمام حقوق و مصالح کی حفاظت کرنا، ظلم کے ازالے میں ان سے تعاون کرنا اور انہیں ان کے تمام حقوق دلوانا۔۔۔''[2]

[2] یوسف القرضاوی، اسلامی معاشرے میں غیر مسلموں کے حقوق و فرائض، مترجم قیصر شہزاد، ۲۰۱۱، ادارہ تحقیقاتِ اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد، صفحہ ۷۰۔

جب لڑائی میں شامل اور دشمن سے بر سرِ پیکار افراد یہ اندازِ فکر اور مزاج رکھتے ہوں تو عام مسلمانوں کے لیے امداد اور فلاح کی سرگرمیوں میں عملی میدان میں غیر جانبداری کا مظاہرہ آسان ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ اس طرح کی کوشش کرنے والے ہر ادارے اور فرد کو یہ بات عملی طور پر ثابت کرنا ہوتی ہے کہ اس کا مقصد بلا تفریق امداد پہنچانا ہے۔ اس کا عمل ہی بتدریج اسے وہ اعتماد فراہم کرتا ہے جو اسے ضرورت مند افراد تک رسائی دیتا ہے۔ اس غیر جانبداری کی ایک مثال مسلم تاریخ میں قائم کردہ عدلیہ کی صورت میں موجود ہے جہاں ہر مقدمے کو مذہب، رنگ، نسل، زبان اور علاقے سے بالاتر صرف حقائق کی بنیاد پر دیکھا جاتا تھا اور جہاں غیر مسلم شہری بھی پیش کردہ حقائق کی بنیاد پر وقت کے خلیفہ کے خلاف فیصلہ حاصل کر سکتا تھا۔

گویا یہ کہنا تو حقیقت کے منافی ہو گا کہ کوئی بھی ایسا فرد یا ادارہ جو بلا تفریق سب کی مدد کرنا چاہتا ہو، وہ ہر صورت میں قلبی اور نفسیاتی طور پر بھی غیر وابستہ اور جانبدار ہی ہوتا ہے، لیکن یہ ضرور ممکن ہے کہ اپنی وابستگی کے باوجود وہ عمل کے میدان میں تکریمِ انسانیت کے وسیع تر اصولوں پر عمل کر سکے اور یہ گنجائش اسلام بھی نہ صرف فراہم کرتا ہے بلکہ اسے پسند بھی کرتا ہے۔

باب ۵

اسلام میں تکریمِ انسانیت: چند عملی مظاہر

تکریمِ انسانیت اسلام کے مبادیات میں سے ہے۔ ضرورت مندوں کی مالی مدد یا عملی معاونت کرنا اہلِ ایمان کی صوابدید نہیں بلکہ مذہبی فریضہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ضرورت مندوں کی مالی مدد، کھانا کھلانا، کپڑے پہنانا، یا اس سے آگے بڑھ کر عملی میدان میں امدادی سامان کی تقسیم، جان بچانے سے لے کر محض راحت پہنچانے والی کسی چھوٹی سی کوشش تک کی سرگرمیاں اسلامی معاشرت کا بنیادی حصہ بن گئی ہیں۔ اسلام اپنے پیروکاروں کی جذباتی، اخلاقی، اور عملی تربیت کے ذریعے انسانی اقدار کو نہ صرف پروان چڑھاتا ہے بلکہ انہیں عمل کے میدان میں فروغ بھی دیتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ قرآنِ مجید اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کا ایک بڑا حصہ تکریمِ انسانیت سے متعلق ہے۔ ان تعلیمات میں سے بعض بنیادی اور لازمی نوعیت کے امور سے متعلق ہیں جو دین کے بنیادی فلسفے اور روح کی تشریح کرتے ہیں اور جن پر انسانی معاملات و اخلاقیات استوار ہوتے ہیں۔ پھر اس جذبے کے تحت کیے گئے اعمال انسان کے لیے مالکِ کائنات کی مدد، رحمت اور برکت کے ساتھ ساتھ گناہوں کی بخشش، اور نیکیوں میں بے پناہ اضافے کا باعث ہوتے ہیں۔ اس باب میں قرآن و حدیث کی تعلیمات کے بعض ایسے پہلوؤں کی جانب توجہ دلانے

کی کوشش کی گئی ہے جو تکریمِ انسانیت پر مبنی افعال کا جذبہ پیدا کرتے، انہیں پروان چڑھاتے اور روزمرہ زندگی میں انہیں فروغ دیتے ہیں۔

فرضیت

اسلام میں انسانی خدمت اور مدد کو فرض کا درجہ حاصل ہے جس کا اطلاق ہر امیر و غریب، مرد و عورت پر ہوتا ہے۔ قرآن و حدیث میں متعدد نصوص ایسی ہیں جو ایسے مالی و عملی صدقات پر ابھارتی ہیں۔ مثلاً سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶۲ میں ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد نہ تو احسان جتلاتے ہیں اور نہ ہی مدد لینے والے کو اذیت پہنچاتے ہیں، ان کا اجر ان کے پروردگار کے پاس محفوظ ہے۔ انہیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم۔ بعض دیگر مقامات پر نیک افعال کا حکم دیا گیا ہے، جیسے قیدیوں یا بیگار میں پابند کیے گئے افراد کی رہائی کے لیے کوشش کرنا، بھوکوں کو کھانا کھلانا اور بیماروں کی دیکھ بھال کرنا۔ ان کے ساتھ ساتھ کئی مقامات پر ایسے لوگوں کو وعید سنائی گئی ہے جو غریبوں، یتیموں اور پسماندہ افراد کی مدد سے گریز کرتے ہوں۔ پھر ایسا بھی نہیں ہے کہ صدقات کی یہ فرضیت محض بعض احکامات اور پند و نصائح تک محدود ہو، بلکہ اسلام انسانی خدمت کا ایک پورا نظام تشکیل دیتا ہے۔

روایتی طور پر اسلامی مملکت میں انسانی خدمت اور نگہداشت کی بنیادی ذمہ داری خلافت کے سپرد تھی، اور بعض غیر معمولی صورتوں میں علما کی تشریحات اور مشورے کے مطابق ریاستی سطح پر بھی اقدامات کیے جاتے تھے، اور ان ریاستی اقدامات میں زکاۃ جمع کرنا اور انہیں ضرورت مندوں تک پہنچانا بھی شامل تھا۔ قرآنی احکامات کی تشریح کرتے ہوئے علماء، جیسے علامہ ابن حزم، نے یہ قرار دیا کہ اگر زکاۃ ضرورت مندوں کی حاجات کو پورا

کرنے کے لیے کافی نہ ہو تو مسلم حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ دیگر دستیاب وسائل کو کام میں لائے (جن میں ریاستی وسائل، مقامی انتظامیہ، کاروباری و معاشرتی گروہ اور افراد شامل ہیں)۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں عرب بھر کو ایک زبردست قحط نے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ انہوں نے مسلم سلطنت کے دیگر صوبوں میں عمال کو حکم دیا کہ وہ خورد و نوش کا سامان جمع کر کے امدادی قافلے ارسال کریں۔ حضرت عمرؓ ذاتی طور پر اس سامان کی تقسیم کے عمل میں شامل ہو گئے۔ ایک موقع پر آپؓ نے فرمایا کہ اگر قحط جاری رہا تو میں ہر مسلم گھرانے کی ذمہ داری لگا دوں گا کہ وہ ایک متعین حاجت مند کو کھانا کھلائے کیونکہ لوگوں کا نقصان نہ ہو گا اگر وہ مل بانٹنے پر عمل کریں گے۔[1]

ایک حدیث میں ہے کہ اس شخص کا مجھ پر ایمان نہیں جو خود پیٹ بھر کر سوئے، جب کہ وہ جانتا ہو کہ اس کا ہمسایہ بھوکا ہے۔ (الطبرانی، المعجم الکبیر: ۷۵۱) اس حدیث کی بنیاد پر علماء نے یہ قرار دیا ہے کہ ایسی صورت میں اس علاقے کے تمام مکین قصوروار ٹھہرائے جائیں گے، کیوں کہ وہ اس ایک فرد کو ضروری مدد فراہم کرنے سے قاصر رہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ مدد پہنچانے کی یہ فرضیت صرف مجبور مسلمانوں سے متعلق نہیں ہے۔ قرآن اور حدیث غیر مسلموں کو بھی انسانیت کی بنیاد پر تعاون اور مدد سے محروم نہیں کرتے۔ اس اصول کا عملی مظاہرہ کئی مرتبہ سامنے آیا۔ ہجرتِ رسول ﷺ کے بعد ابتدائی عرصے میں مضرؔ کے علاقے میں قحط آ گیا۔ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے انسانی بنیادوں پر ایک امدادی قافلہ ترتیب دیا تاکہ اس علاقے میں متاثرہ آبادی کی مدد کی جا سکے، اگرچہ وہ لوگ اس وقت تک اسلام نہ لائے تھے۔

[1] عزالدین بلیک، منہاج الصالحین، دار الفتح، بیروت، ۱۹۸۵، ص ۵۱۳

ایمان کی تصدیق

اسلام چاہتا ہے کہ ایمان کا اظہار زندگی کے تمام گوشوں اور شعبوں میں ہو، جن میں انسانی تعلقات بھی شامل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ حکیم میں جہاں بھی ایمان کا تذکرہ ہے، اس کے فوراً بعد عملِ صالح کا تقاضا موجود ہے۔ یہ اور اس طرح کے الفاظ کہ 'جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے'، قرآن میں متعدد مرتبہ آئے ہیں۔ ان مقامات میں سے ایک میں یوں کہا گیا ہے کہ ''بے شک انسان خسارے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے۔۔۔''(العصر: ۲، ۳) ایک اور جگہ فرمان ہے کہ ''جو لوگ ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے، ان کے لیے خوش حالی اور عمدہ ٹھکانہ ہے'' (الرعد: ۲۹)

لفظ صدقہ، جس کا عام مفہوم مالی عطیہ کا ہے، عربی کے لفظ تصدیق سے نکلا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ''صدقہ تصدیق ہے''[2] گویا ایک مسلمان کا تقویٰ حاجت مندوں کی ضرورت پورا کرنے کی شکل میں سامنے آتا ہے۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ اللہ کی محبت انسان کے دل کو مادہ پرستی سے پاک کر دیتی ہے۔

گناہوں کا کفارہ

اسلام دینِ فطرت ہے اور انسان سے خطا ہو جانا ایک فطری امر ہے۔ انسان اپنے خالق اور دیگر مخلوقات سے اپنے تعلق کے حوالے سے متعدد بار غلطیاں کر بیٹھتا ہے۔ تاہم اسلام کا

[2] ابن رجب، جامع العلوم والحکم، الرسالہ، تیسرا ایڈیشن، جلد دوم، ۱۹۹۱، ص ۵؛ صحیح مسلم، کتاب الطہارۃ، حدیث نمبر ۱

مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنی غلطیوں کو سدھارنے کی طرف مسلسل متوجہ رہے۔ اسلام نے انسان کی اصلاح کی غرض سے متعدد کشادہ راستے کھول رکھے ہیں جن میں توبہ وندامت، انصاف کے لیے خود کو پیش کر دینا، کسی کو پہنچائے گئے نقصان کا ازالہ کرنا وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ جو گناہ سرزد ہو چکے ہوں، انہیں مٹانے کے لیے اسلام مختلف وسیلے فراہم کرتا ہے۔ اسی حوالے سے نیکی و بھلائی کے کام گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ صدقہ گناہوں کو ایسے مٹاتا ہے جیسے آگ پانی کو۔ (صحیح البخاری: ۲۹۵۱) اسلام گناہوں کے کفارے کو کیسے انسانوں کے لیے آسان اور مفید بناتا ہے، اس کی مثال وہ صورتیں ہیں جو قسم کی خلاف ورزی پر بطور کفارہ اپنائی جاسکتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اللہ تمہاری بے ارادہ قسموں پر تم سے مواخذہ نہیں کرے گا لیکن پختہ قسموں پر (جن کے تم خلاف کرو گے) مواخذہ کرے گا۔ تو ان کا کفارہ دس محتاجوں کو اوسط درجے کا کھانا کھلانا ہے جو تم اپنے اہل وعیال کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے دینا یا ایک غلام آزاد کرنا اور جس کو میسر نہ ہو وہ تین روزے رکھے''۔ (المائدۃ: ۸۹) اسی طرح رمضان کے فرض روزے کا بغیر کسی شرعی عذر کے چھوٹ جانا ایسی غلطی ہے جس کے کفارے کے لیے ایک مسلمان کو ساٹھ مسلسل روزے رکھنا یا ساٹھ محتاجوں کو کھانا کھلانا لازم ہے۔ اسی طرح کسی معذوری کی بناء پر حج یا روزے کی ادائیگی میں کوتاہی کا کفارہ بھی مقرر کیا گیا ہے۔

رضائے الٰہی کا حصول

انسانوں کی خدمت اور ان کے لیے سکون وراحت کی جستجو اللہ کی رضا کے حصول کا ایک بڑا ذریعہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ انسانوں میں سے اللہ کو وہ شخص محبوب ہے جو

دوسروں کی مدد کرے۔[3] ایک دوسری حدیث میں آپ سے روایت ہے کہ اللہ نے دوسروں کی مدد کرنے کا جذبہ انسانوں میں ودیعت کر رکھا ہے، جو لوگ بھلائی سے کام لیتے ہیں اللہ آخرت کے دن انہیں سزا سے محفوظ رکھے گا۔ (صحیح مسلم: ۲۲۱۵) سورۃ آل عمران کی آیات ۱۳۳ اور ۱۳۴ میں اللہ نے اپنی رضا کو اپنی راہ میں خرچ کرنے والوں کے لیے خاص کرتے ہوئے فرمایا ہے: ''اپنے پروردگار کی بخشش اور بہشت کی طرف لپکو جس کا عرض آسمان اور زمین کے برابر ہے اور جو اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے، جو آسودگی اور تنگی میں خرچ کرتے ہیں اور غصے کو روکتے اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں۔ اور اللہ نیکوکاروں کو پسند کرتا ہے۔''

اللہ کی رضا کے حصول کا ایک اور ذریعہ دعا ہے۔ دعا اگرچہ ایک بندے اور اس کے رب کا باہمی معاملہ ہے لیکن اس کا گہرا تعلق ان معاملات کے ساتھ طے کر دیا گیا ہے جو اس انسان کے دیگر مخلوقات کے ساتھ ہیں۔ قرآن اور حدیث میں متعدد مقامات پر اللہ کی یاد اور اس کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ فوراً ہی انسانوں سے حسنِ سلوک، ان کی مدد، ناداروں، ضرورت مند مسافروں، بیواؤں اور مصیبت زدگان پر رحم کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ ان میں سے بعض کا تذکرہ اس تحریر میں موجود بھی ہے۔ اسی بات کو رسول اللہ ﷺ نے یوں بیان فرمایا ہے: ''سخی اللہ کے قریب ہے، انسانوں کے قریب ہے، جنت کے قریب ہے۔۔۔'' (السیوطی، الجامع الصغیر، نمبر ۴۸۹۴)

[3] السیوطی، الجامع الکبیر، دار الکتب المصریۃ، حدیث نمبر ۹، جلد اول، ص۔ ۴۰۹

آخرت میں حساب کتاب

اسلام اس بات کو بار بار ذہن نشین کرواتا ہے کہ موت انسانی زندگی کا اختتام نہیں بلکہ اس کے بعد برزخ یعنی قبر میں ایک دور گزارنے کے بعد اسے بالآخر حشر کے دن اٹھایا جائے گا، جہاں حساب کتاب کے بعد اسے اپنی ہمیشہ کی زندگی گزارنے کے لیے جنت یا جہنم میں بھیج دیا جائے گا۔ اس لحاظ سے دنیا کی یہ زندگی محض ایک راستہ ہے جس پر چلتے ہوئے انسان کا طرزِ عمل اس بات کا تعین کرتا ہے کہ اس کا آخری اور حتمی مقام کیا ہوگا۔ اسی لیے اسلام یہ چاہتا ہے کہ انسان اپنی خواہشات کو اپنی پوری رضامندی کے ساتھ اپنے اور اس کائنات کے خالق کے احکامات کے تابع کر دے۔ یہی احکامات جہاں فرد اور رب کے تعلق کی وضاحت کریں گے، وہاں یہ بھی بتائیں گے کہ دیگر انسانوں اور مخلوقات کے ساتھ انسانی رویہ کیا ہونا چاہیے۔ یہ بھی واضح بتا دیا گیا ہے کہ انسان کے ہر لمحے اور ہر عمل کو درج کیا جا رہا ہے اور اس کے بدلے اس کی نیکیوں کے ثواب یا برائیوں کے وبال میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اس بیلنس شیٹ میں انسان کی نیت اور افعال دونوں کو لکھا، پرکھا اور نوازا جاتا ہے۔

انسانی ہمدردی اور خدمت کے تمام افعال بھی اسی ذیل میں آتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک انسان کے لیے اجر کا ذریعہ ہے۔ سورۃ الحدید کی آیت ۱۸ میں ہے کہ ''جو لوگ خیرات کرنے والے ہیں، مرد بھی اور عورتیں بھی، اور اللہ کو بھلا قرض دیتے ہیں، ان کو بڑھا چڑھا کر اجر دیا جائے گا اور ان کے لیے عزت بھر اصلہ ہے۔'' دراصل انسانوں کی بھلائی کے لیے کیا جانے والا ہر فعل اللہ کو دیا گیا ایسا قرض ہے جو کئی گنا منافع کے ساتھ واپس کیا جائے گا، اور یہ ایسی سرمایہ کاری ہے جس میں نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں کیوں کہ قرض کائنات کے رب کو دیا گیا ہے۔ یہی بات ایک اور آیت میں یوں بیان کی گئی ہے: ''کون ہے جو اللہ کو بھلا

قرض دے تاکہ وہ اسے بڑھا چڑھا کر اسے لوٹا دے۔'' (البقرۃ: ۲۴۵)۔ انسان کی نیت اور ایمان کے مطابق اس اجر کے ۷۰۰ گنا تک بلکہ اس سے بھی زیادہ بڑھا دیئے جانے کا امکان موجود ہے۔ ''جو لوگ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے مال کی مثال اس دانے کی سی ہے جس سے سات بالیں اگیں اور ہر ایک بال میں سو سو دانے ہوں۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے زیادہ کر دیتا ہے۔ اور اللہ بڑا کشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔'' (البقرۃ: ۲۶۱) رسول اللہ ﷺ نے بھی بارہا اس بات کی وضاحت کی ہے کہ دنیا میں کی گئی بھلائی کس طرح آخرت میں اس کے کام آئے گی۔ اللہ کی راہ میں انسانوں کی بھلائی کے لیے کیا گیا خرچ قبر اور حشر میں انسان کی حفاظت کا ذریعہ بن جائے گا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ''خیرات کرنے والوں کے لیے یہ خیرات قبر کی آگ کو بجھانے کا ذریعہ ہو گی۔ قیامت کے دن مسلمان اپنے صدقات کے سائے میں پناہ لے سکے گا۔''[4] اس کے برعکس وہ لوگ جو خرچ کرنے کی اس روش سے اعراض کریں، ان کے لیے قرآن اور احادیث میں متعدد وعیدیں بھی موجود ہیں۔ قرآن میں ہے: ''اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، انہیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیجیے۔ اس دن جب اس خزانے کو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا اس سے ان کی پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا کہ یہ وہی ہے جو تم جمع کیا کرتے تھے۔ اب اس کا مزہ چکھو۔'' (التوبۃ: ۳۵) اسی طرح اس شخص کا جو اللہ پر ایمان نہیں لاتا اور اس کا جو مساکین کو کھانا کھلانے میں بخل کرتا ہے، ایک ساتھ ذکر کرتے ہوئے قیامت کا یہ منظر بیان کیا گیا ہے: ''پکڑ لو اسے اور اسے طوق پہنا دو اور پھر اسے بھڑکتی آگ میں جھونک دو۔ پھر ستر ہاتھ لمبی زنجیر میں اسے جکڑ

[4] البیہقی، شعب الایمان، دار الکتب العلمیہ، جلد سوم، حدیث نمبر ۳۳۴۷، بیروت، ۱۹۹۰، ص ۲۱۲

دو۔ یہ وہی ہے جو اللہ پر ایمان نہ رکھتا تھا جو سب سے بالا تر ہے، اور مسکینوں کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دلاتا تھا۔۔۔" (الحاقۃ: ۳۰ تا ۳۲)

آفات سے بچاؤ

ضرورت مند اور نادار افراد کی مدد اہلِ ایمان کے لیے آفات سے بچاؤ کا بھی ایک ذریعہ ہے۔ اسی لیے پریشانی میں مبتلا ہونے، کاروباری سودوں، فصل کی کاشت، سفر کے آغاز وغیرہ میں اللہ کی رضا اور رحمت کے حصول اور آفات سے بچاؤ کے لیے ناداروں، بیماروں اور پریشان حال افراد کی مدد کی جاتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ صدقہ انسان کو بری موت سے بچاتا ہے۔[5] اور یہ کہ صدقہ آفات کے ستر دروازوں کو بند کرتا ہے۔[6] نیز یہ کہ صدقہ اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کرتا اور بری موت سے بچاتا ہے۔[7] یہی وجہ ہے کہ بیماری کی صورت میں شفایابی کے لیے دعا اور دوا کے ساتھ ساتھ صدقہ دینا مسلم معاشروں میں معمول ہے۔ یہ معمول بھی دراصل اسی لیے بنا کہ رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو یہ ترغیب دی کہ "اپنی دولت کو زکاۃ سے محفوظ بناؤ اور اپنے بیماروں کا علاج صدقہ کے ذریعے کرو۔"[8]

صدقہ جاریہ کا تصور

قرآن و حدیث کی نصوص بتاتی ہیں کہ انسانی ہمدردی میں کیے گئے افعال کی برکات وقت کے لحاظ سے محدود نہیں ہیں۔ صدقہ ماضی کے گناہوں کو مٹاتا، حال کو بابرکت بناتا اور مستقبل کو

---

[5] الحاکم، المستدرک، ص۔ ۱۲۴

[6] طبرانی، المعجم الکبیر، جلد چہارم، حدیث نمبر ۴۴۰۲

[7] البیہقی، شعب الایمان، دار الکتب العلمیہ، جلد سوم، حدیث نمبر ۳۳۵۱، بیروت، ۱۹۹۰، ص ۲۱۳

[8] طبرانی، معجم الزوائد، جلد سوم، ص ۶۳

محفوظ بناتا ہے۔ انسان کی نیکی کا فائدہ اس کے والدین کو اس صورت میں بھی پہنچتا ہے جب وہ اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہوں۔ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابیؓ نے جب آپؐ سے پوچھا کہ اگر وہ اپنی مرحوم والدہ کی طرف سے صدقہ دے گا تو کیا ان کو اس کا اجر ملے گا، تو ان صحابی نے اپنے سوال کا جواب اثبات میں پایا۔ (متفق علیہ)

صدقہ کے مفہوم کی ہمہ گیریت

جب اسلام صدقہ کا ذکر کرتا ہے تو اس سے مراد انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں بے شمار ایسے افعال آتے ہیں جن کا مقصد دوسروں کو راحت پہنچانا ہو، یہاں تک کہ کسی کو دیکھ کر مسکرا دینا اور راستے سے کانٹا یا پتھر ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔ صدقے کی بعض دیگر صورتیں یہ ہیں۔

غذائی امداد اور بھوک سے جنگ: رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ بہترین صدقہ بھوکے کو کھانا کھلانا ہے۔[9] عید الاضحیٰ کے موقع پر قربانی کرنے والوں کو یہ ترغیب دی گئی ہے کہ وہ گوشت کا ایک حصہ خود استعمال کریں، ایک اپنے عزیزوں اور دوستوں تک پہنچا کر سماجی روابط کو مضبوط کریں اور تیسرا حصہ ناداروں تک پہنچا کر انہیں بھی خوشیوں میں شریک کریں۔ اسی طرح اگر کوئی شخص طویل بیماری کی وجہ سے فرض روزہ رکھنے سے معذور ہو تو اس روزے کا متبادل کسی ضرورت مند کو کھانا کھلانا قرار دیا گیا ہے۔ (البقرۃ: ۱۸۴) بھوکے کو کھانا کھلانا اسلامی معاشرت کا اس قدر بنیادی حصہ ہے کہ ایسا نہ کرنے والوں کو اس اجتماعیت کا حصہ ہی نہیں گردانا گیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: وہ

[9] البیہقی، شعب الایمان، دار الکتب العلمیہ، جلد سوم، حدیث نمبر ۳۳۶۷، بیروت، ۱۹۹۰، ص ۲۱۷

شخص مسلمان نہیں جو خود تو پیٹ بھر کر سوئے لیکن اس کا پڑوسی بھوکا ہو۔[10] سورۃ الدھر کی آیات ۵تا۹ان لوگوں کے لیے جنت کی نعمتوں کی خوش خبری دیتی ہیں جو اللہ کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے مساکین، یتیموں اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔

یتیموں کی کفالت: اسلام ایسے افراد کی کفالت کا خاص اہتمام کرتا ہے جو والدین یا ان میں سے کسی ایک کی شفقت سے محروم ہو چکا ہو۔ قرآن مجید کی متعدد آیات یتیموں پر شفقت اور ان کی نگہداشت کی ترغیب دلاتی ہیں اور ان کے ساتھ بد سلوکی کرنے والوں کے لیے سخت سزا کا وعدہ کرتی ہیں۔ یہاں تک کہ یتیموں کی کفالت نہ کرنے کو دین کو جھٹلانے کے مترادف قرار دیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''کیا تم نے دیکھا اس کو جو دین کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور بھوکے کو کھانا کھلانے کی ترغیب نہیں دلاتا'' (الماعون: ۱تا۳)، نیز یہ کہ: ''جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں آگ بھرتے ہیں اور دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔'' (النساء: ۱۰) رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: اللہ میں بے زار ہوں اس شخص سے جو ان دونوں کمزور گروہوں کے حقوق سلب کرے یعنی یتیموں اور عورتوں کے۔[11] ایک صحابی نے جب اپنی بے سکونی کی شکایت کی تو آپؐ نے انہیں کسی یتیم کی نگہداشت کا ذمہ لینے کا مشورہ دیا۔ آپؐ نے فرمایا: اگر تم دل کی نرمی اور اپنے کاموں میں کامیابی چاہتے ہو تو یتیموں پر رحم کرو۔ ان کے سر پر ہاتھ پھیرو اور اپنے کھانے میں انہیں شریک کرو۔[12] یعنی یتیم کا خیال صرف مادی طور پر ہی نہیں بلکہ

---

[10] البیہقی، شعب الایمان، دار الکتب العلمیہ، جلد سوم، حدیث نمبر ۳۳۸۹، بیروت، ۱۹۹۰، ص ۲۲۶

[11] صالح بن حمید، نضرۃ النعیم، دار الوسیلۃ، جلد ہشتم، ص ۳۲۵۴

[12] الالبانی، صحیح الترغیب والترھیب، المکتب الاسلامی، جلد دوم، ص۔ ۶۷۶

نفسیاتی اور جذباتی سطح پر بھی رکھنا ضروری ہے۔ اللہ کے نبی نے اپنی شہادت کی انگلی اور درمیان کی انگلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یتیم کی کفالت کرنے والا اور میں جنت میں اس طرح (ایک ساتھ) ہوں گے۔[13] آپؐ نے فرمایا، اللہ کو وہ گھر سب سے زیادہ پسند ہے جس میں کسی یتیم کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا ہو۔[14]

پناہ گزینوں کی حمایت: رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے وقت 'مہاجر' کا مفہوم وہ نہ تھا جس سے آج ہم واقف ہیں۔ تاہم اسلام کو آغاز ہی سے ایسے حالات کا سامنا رہا جس میں مہاجرت ایک مستقل مسئلہ رہا۔ اسلام کے دور کی پہلی ہجرت وہ تھی جب مشرکینِ مکہ کے جبر سے بچنے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے کہنے پر مسلمانوں نے حبشہ میں پناہ لی۔ جب جبر حد سے گزر گیا تو اللہ کے نبی ﷺ اور مسلمانوں نے یثرب کی طرف سفر کیا جہاں کے مکینوں نے کشادہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین کے ساتھ طرزِ عمل کے سنہری اصول طے کیے اور 'انصار' اور 'مہاجرین' کے درمیان اخوت کا رشتہ استوار کیا۔ اس اصول کے تحت مہاجرین کو کھانے، کپڑے، رہائش اور یہاں تک کہ کاروبار میں شریک کیا گیا، یہاں تک کہ مہاجرین اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے مہاجر کو دی جانے والی مدد اس پر احسان نہیں بلکہ اس کا حق ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اور رشتہ داروں اور محتاجوں اور مسافروں کو ان کا حق ادا کرو۔'' (بنی اسرائیل: ۲۶)

---

[13] الحافظ ابن حجر، فتح الباری، حدیث نمبر ۵۳۰۴، جلد نہم، بیروت، ص ۵۴۹

[14] البخاری، الادب المفرد، حدیث نمبر ۱۳۷

طویل مدتی ترقیاتی منصوبے: فوری و ہنگامی امداد اور عمومی معاونت کے علاوہ اسلام ایسے اقدامات کی بھی حوصلہ افزائی کرتا ہے جو لوگوں کی زندگی میں دور رس تبدیلی لاسکیں۔ اس جانب رہنمائی کرنے والی متعدد احادیث میں سے ایک وہ ہے جس کے مطابق رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب کوئی فرد مر جاتا ہے تو اس کے تین چیزوں کے سوا اس کا کوئی عمل اسے فائدہ نہیں پہنچاتا: صدقہ جاریہ، مفید علم اور صالح بیٹا جو اللہ کو یاد کرتا ہے۔''[15] نیز آپ ﷺ کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کوئی صدقہ دیتا ہے تو اس کا یہ صدقہ اسے اس وقت تک نفع دیتا ہے جب تک یہ باقی رہتا ہے۔[16] گویا کوئی عمل جتنا دیر پا ہو گا اتنا ہی زیادہ عرصہ اس کا اجر جاری رہے گا۔ ایسے اعمال میں وہ چیزیں شامل ہیں جو، مثال کے طور پر، غذا یا پانی کی فراہمی کا انتظام کریں یا جیسے کسی کو کام کے اوزار لے کر دیئے جائیں وغیرہ۔ ایک حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے صدقاتِ جاریہ کی مثال میں آب رسانی کے انتظام، کنواں کھدوانے، اور درخت لگانے کا ذکر کیا۔[17] ایک اور حدیث میں ہے کہ اگر کوئی مسلمان کوئی پودا لگاتا ہے تو اسے قیامت کے دن تک اجر ملتا رہے گا جب بھی کوئی انسان، جانور، یا پرندہ اس پودے کا پھل کھائے گا۔ (السیوطی، الجامع الصغیر، نمبر ۸۸۷۳) ایسا ہی اجر اس مسلمان کے لیے بھی بتایا گیا ہے جو کنواں کھدوائے۔ (صحیح البخاری، ۵۷۵۷) آپؐ نے بالخصوص اس علاقے میں کنواں کھدوانے کی ترغیب دی جس میں پانی کی قلت تھی، لہٰذا فرمایا کہ جو کوئی روما میں کنواں کھدوائے گا وہ جنت میں جائے

---

[15] البیہقی، شعب الایمان، دار الکتب العلمیہ، جلد سوم، حدیث نمبر ۳۴۴۷، بیروت، ۱۹۹۰، ص ۲۴۷

[16] صحیح مسلم: ۳۹۶۸

[17] الالبانی، صحیح الجامع، حدیث نمبر ۳۶۰۲، جلد اول، ص ۴۷۶

گا۔[18] ایک مرتبہ آپؐ نے فرمایا کہ کسی نادار کے لیے بہترین صدقہ یہ ہے کہ اسے ایسی اونٹنی دلائی جائے جو بہت دودھ دیتی ہو اور بچہ جننے کے قریب ہو۔[19] انہی ارشادات سے سبق لیتے ہوئے بہت سے مسلم رفاہی اداروں نے گائے، بھیڑ اور بکریوں کو عوامی فلاح کے لیے تقسیم کیا ہے اور اس کے نتائج بہت مثبت رہے ہیں، بالخصوص بھارت، بوسنیا ہرزیگووینیا، صومالیہ وغیرہ میں۔

چھوٹے قرضے: ترقی کے عمل سے وابستہ ہر فرد جانتا ہے کہ غربت کے خاتمے، انفرادی ترقی اور اجتماعی معیشت کی بڑھوتری کے لیے چھوٹے قرضے کس قدر اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ کسی پسماندہ اور غریب شخص کو ایسے اوزار فراہم کر دینا یا اس مقصد کے لیے قرض دے دینا کہ وہ اپنی آمدن کا کوئی مستقل ذریعہ اختیار کر سکے، غربت اور پسماندگی کو جڑ سے ختم کرنے میں مدد کرتا ہے۔ اس کے ذریعے سے ایک ضرورت مند کو بہت جلد غربت و پسماندگی سے نکال کر باعزت زندگی کی طرف لایا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اس حوالے سے بہت مؤثر رہنمائی کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ ''کوئی دودھ دینے والا جانور (بکری، اونٹ وغیرہ) کسی کو صدقہ میں دینے یا قرض دینے کا ثواب ایسا ہی ہے جیسے ایک غلام آزاد کرنے کا۔''[20] آپؐ نے قرض کو صدقہ قرار دیا[21] اور ساتھ ہی یہ ترغیب بھی مسلسل دی کہ قرض کی ادائیگی کرنے والے کو سہولت دی جائے۔ حدیث

---

[18] الحافظ ابن حجر، فتح الباری، جلد پنجم، ص ۵۱۰

[19] البرکانی، لؤلؤ والمرجان، حدیث نمبر ۵۹۹، جلد اول، ص ۲۱۱

[20] الحافظ ابن حجر، فتح الباری، دار الکتب العلمیۃ، جلد ثالث، حدیث نمبر ۱۳۸۸، ص ۳۲۵

[21] البیہقی، شعب الایمان، جلد ثالث، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، ۱۹۹۰، حدیث نمبر ۲۸۴

شریف میں ہے کہ جو کوئی قیامت کے دن سخت حساب سے بچنا چاہتا ہے وہ قرض دار کو مہلت دے یا اس کا قرض معاف کر دے۔[22] مزید آپؐ نے فرمایا کہ قرض واپسی کا متعین دن گزر جانے کے بعد ہر روز قرض خواہ کو دوہرے صدقے کا اجر ملتا ہے۔[23] یہ بھی یاد رہے کہ اسلام میں تمام قرض بلا سود ہوتے ہیں اور قرض دار کو وصول شدہ رقم سے ایک پائی بھی ادا نہیں کرنا ہوتی۔

زکاۃ

ایمان کی شہادت اور نماز کے بعد اسلام کا تیسرا بنیادی رُکن زکاۃ ہے۔ جہاں ایمان ہر بھلائی کی بنیاد ہے اور نماز کا سماجی پہلو ہر انسان کو معاشرے میں اس طرح سمو دیتا ہے کہ وہ اپنے اہلِ محلہ اور اہلِ علاقہ سے مسلسل ربط میں رہتا ہے وہاں اسلام کے سماجی و معاشی نظام میں زکاۃ انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ ایک ایسا نظام تشکیل دیتی ہے جس کے تحت امیر اور آسودہ حال افراد کی دولت سے غریب اور حاجت مند افراد کا حصہ وصول کر کے ان تک پہنچایا جاتا ہے۔ ذاتی استعمال کے علاوہ ایک سال تک نصاب سے زائد جمع رہنے والی دولت کا اڑھائی فی صد، اسی طرح سیر اب شدہ زمین کی زرعی آمدن میں سے پانچ فی صد اور بارانی زمین کی فصل کا دس فیصد وہ کم از کم حصہ ہے جو اہلِ ثروت کے مال میں غریبوں کے لیے لازم قرار دیا گیا ہے۔ اسلام کے نظام میں نماز اور زکاۃ کو یکجا طور پر جو اہمیت حاصل ہے اس کا اندازہ اس بات

---

[22] المنذر، الترغیب والترھیب، دار ابن کثیر، بیروت، حدیث نمبر ۱۳۲۴، ص ۶۸۷

[23] ایضاً، حدیث نمبر ۱۳۲۹، ص ۶۹۰

سے لگایا جاسکتا ہے کہ قرآنِ مجید میں ۳۰ مختلف مقامات پر نماز اور زکاۃ کی فرضیت واہمیت کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیا کہ: ''آپ ان کے مالوں میں سے صدقہ لیجیے جس کے ذریعے سے آپ ان کو پاک صاف کر دیں اور ان کے لیے دعا کیجیے، بلاشبہ آپ کی دعا ان کے لیے موجبِ اطمینان ہے۔ اور اللہ خوب سنتا ہے اور خوب جانتا ہے۔'' (التوبۃ: ۱۰۳) اسی لیے جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو انہیں یہ نصیحت بھی فرمائی کہ: ''انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال پر کچھ صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے مال دار لوگوں سے لے کر ان کے محتاجوں میں لوٹا دیا جائے گا۔''[24] اسلامی حکومت سرکاری سطح پر زکاۃ جمع کرنے کا اہتمام کرتی ہے اور اس بات کو یقینی بناتی ہے کہ اسلام کے اس اہم حکم کی پاس داری کی جائے اور اگر کوئی اس کی ادائیگی سے انکار کرے تو ریاست اس کے خلاف حسبِ ضرورت قوت بھی استعمال کرتی ہے۔ زکاۃ کی فرضیت اس قدر سخت معاملہ ہے کہ کسی شخص کی وفات کے بعد بھی یہ ساقط نہیں ہوتی اور میت کے ورثا پر یہ لازم ہے کہ وہ اس کے ذمہ واجب الادا رقم اس کے مال میں سے ادا کریں۔ غریبوں کا یہ حق اس قدر مقدم ہے کہ دیگر تمام قرض ادا کرنے سے پہلے زکاۃ کی ادائیگی لازم ہے۔ زکاۃ کو اہلِ ثروت کے مال میں غریبوں کا حق قرار دینے کا عملی مطلب یہ ہے کہ کل مالیت اور اس میں طے شدہ حصے کو باقاعدہ حساب لگا کر ادا کیا جائے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں انسان کو داخلی طور پر زکاۃ کی ادائیگی اور پسماندہ طبقات کی مدد کے لیے آمادہ کرنے اور حکومت کی سطح پر زکاۃ کی وصولی اور تقسیم کا

[24] الحافظ ابن حجر، فتح الباری، بیروت، حدیث نمبر ۲۷۷۸، جلد پنجم، ص ۵۱۰

نظام بنانے کے ساتھ ساتھ مختلف اجناس اور ان پر واجب الادا زکاۃ کا حساب لگانے کا ایک پورا علم بھی تشکیل دیا گیا ہے۔ اسی حوالے سے ان آٹھ مدّات کی وضاحت خود سورۃ التوبہ کی آیت ۶۰ میں کی گئی جن کو زکاۃ ادا کی جاسکتی ہے: ''صدقات تو دراصل حق ہے فقیروں کا اور مسکینوں کا اور ان اہلکاروں کا جو صدقات کی وصولی پر مقرر ہوتے ہیں اور ان افراد کے لیے جن کے دلوں میں اسلام کی الفت پیدا کرنا مقصود ہے نیز انہیں غلاموں کو آزاد کرنے میں، اور قرض داروں کے قرض ادا کرنے میں اور اللہ کے راستے میں اور مسافروں کی مدد میں خرچ کیا جائے۔ یہ ایک فریضہ ہے اللہ کی طرف سے۔ اللہ علم کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک ہے۔''

اس تصور کے مطابق انسانی خدمت میں مصروف افراد کی کوششیں صرف فوری امداد اور ہنگامی تعاون تک محدود نہیں ہیں بلکہ پناہ گزینوں اور آفت زدہ افراد کے علاوہ ایسے لوگ جن کی ضرورت نسبتاً طویل مدتی ہو، ان تک بھی زکاۃ کے ثمرات پہنچنے چاہییں، جیسے مقروض اور غریب افراد۔ زکاۃ کی مد سے ضرورت مند افراد کی بنیادی سماجی ضروریات جیسے کھانا، کپڑے، رہائش، صحت اور تعلیم کو پورا کیا جاسکتا ہے۔ بالعموم زکاۃ کا استعمال اسی معاشرے میں کیا جاتا ہے جہاں سے یہ جمع کی گئی ہو لیکن انتہائی ضرورت، جیسے قحط، قدرتی آفت یا جنگ کی صورت میں اس کا استعمال متاثرہ خطے میں کیا جاسکتا ہے۔ فقہ مالکی کے مطابق تو امداد اس قدر ہو سکتی ہے کہ جس سے متاثرہ فرد کی ایک سال کی ضروریات پوری ہو سکتی ہوں۔ شافعیہ کا خیال ہے کہ امداد اس قدر کر دی جانی چاہیے کہ وصول کرنے والا اپنے پیروں پر کھڑا ہو سکے۔ خلیفۂ ثانی عمرؓ کا قول ہے کہ جب تم کسی کو دو تو اتنا دو کہ وہ غریب نہ رہے۔[25]

[25] ابو عبید القاسم، کتاب الاموال، ص ۵۶۵

تاریخ دان اس بات پر متفق ہیں کہ زکاۃ کے نظام نے عرب اور گردونواح میں پھیلی مسلم سلطنت سے صرف چند سال میں غربت کا خاتمہ کر دیا۔ انسانوں کی عزت کا تحفظ ہوا اور رفتہ رفتہ اسی نظام کی برکات سے غلامی کے رواج کا خاتمہ ہو گیا۔

وقف

وقف صدقۂ جاریہ کی ایسی صورت ہے جس میں وقف کرنے والا اپنی ملکیت کا ایک حصہ کسی بھلائی کے کام کے لیے اس طرح مختص کر دیتا ہے کہ اس کا مسلسل فائدہ سماجی فلاح کے کسی کام میں آتا رہے۔ اسلامی معاشرت میں جاری اس رجحان کی بنیادیں بھی دراصل اسلام کے دیئے ہوئے اس تصور میں ہے کہ ''لوگوں میں سے بہترین وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔''[26] انسانوں کی خدمت کے ذریعے اللہ کی رضا حاصل کرنے کا جو طریقہ رسول اللہ ﷺ نے سکھایا ہے اس میں سب سے دیرپا صدقہ جاریہ ہے۔[27]

عمر بن الخطابؓ کے پاس زمین کا ایک ٹکڑا تھا جو آپ کو بہت عزیز تھا۔ آپؓ نے اس اراضی کو اللہ کی راہ میں عطیہ کرنے کا فیصلہ کیا اور اس حوالے سے رسول اللہ ﷺ سے رہنمائی طلب کی تو رسول اللہ ﷺ نے مشورہ دیا کہ تم چاہو تو اس اراضی کو محفوظ رکھتے ہوئے اس کا پھل صدقہ کر دیا کرو، لیکن یاد رکھو کہ اس اراضی کو نہ تو بیچا جا سکے گا، ہدیہ کیا جا سکے گا اور نہ ہی ورثاء میں تقسیم کیا جا سکے گا۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہؓ میں سے تقریباً اسّی افراد نے اس طرح اپنی ملکیت کا کچھ حصہ عام فلاح کے لیے وقف کر دیا تھا اور یہیں سے

---

[26] الاصبحانی، احمد بن عبداللہ، ''حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء''، ۱۴۲۳ھ، بیروت: دار الکتب العلمیۃ، ۳۸۳

[27] البیہقی، شعب الایمان، دار الکتب العلمیہ، جلد سوم، حدیث نمبر ۳۴۴۷، بیروت، ۱۹۹۰، ص ۲۴۷

مسلم معاشروں میں وقف کا سلسلہ چل نکلا اور اس قدر عام ہوا کہ موجودہ دنیا کے بیشتر مسلم ممالک میں وقف کے انتظام کے لیے باقاعدہ وزارتیں قائم کی گئی ہیں۔

وقف شدہ املاک کی آمدن متعدد اور متنوع مقاصد کے لیے استعمال کی جاتی ہے جن میں سماجی سہولیات کی فراہمی، بنیادی انسانی خدمت کے اقدامات، ثقافتی تحفظ و ترویج اور معاشی بہتری کے منصوبے شامل ہیں۔ وقف کے تحت عمل میں لائے جانے والے منصوبوں میں فراہمی آب، اسکولوں اور ہسپتالوں کی تعمیر، پسماندہ طبقات کے لیے گھروں کی تعمیر، ہاسٹلز اور عارضی رہائش گاہیں، راستوں کی دیکھ بھال، نادار افراد کے علاج، تجہیز و تکفین کے انتظامات، غریب نوجوانوں کی شادی کے انتظامات، یتیموں کی نگہداشت، مسافروں، مزدوروں اور ضرورت مندوں کو کھانا کھلانے، اور مساجد کی تعمیر و دیکھ بھال جیسے امور شامل ہیں۔[28]

جب تک اسلامی حکومت قائم رہی، بیت المال کے ذریعے زکاۃ و عشر کا انتظام اور معاشرے کے پسماندہ طبقات کی خبر گیری ریاست کا فرض رہا۔ قومی ریاست کے ارتقا اور فلاحی ریاست کے تصور کے ساتھ ریاست کی ہیئت بھی اور عوامی فلاح کا انداز بھی تبدیل ہو گیا۔ ایسے میں اسلام کے دیئے ہوئے سماجی نظام اور معاشی بڑھوتری کی کچھ صورت تو بعض مسلم ریاستوں میں حکومتی سطح پر قائم ہے، لیکن معاشرے میں پیوست ان اقدار کو عملی شکل دینے اور مفید بنانے کا کام بڑی حد تک غیر حکومتی رفاہی تنظیمیں کر رہی ہیں۔ رابطے اور آمدورفت کے وسائل کی ترقی کے ساتھ اب انسانی خدمت بھی حدود کی پابند نہیں رہی۔ متعدد مسلم غیر حکومتی تنظیموں اور اداروں نے خود کو اسی طرح استوار کیا ہے کہ مسلم معاشرت

[28] دیکھیے: مصطفیٰ سبوعی، من روائع حضارتنا، دار السلام، قاہرہ، ۱۹۹۸

کے زریں اصولوں کو عمل میں لا کر حاجت مندوں تک پہنچا جا سکے اور انہیں باعزت اور مفید مقام دلانے میں مدد کی جا سکے۔ اس مقصد کے لیے یہ مقامی، ملکی اور بین الاقوامی تنظیمیں جہاں زکاۃ، عشر اور صدقات وصول کرتی ہیں وہاں رمضان اور عید الاضحی کے موقع پر ایک بڑی سرگرمی کے ذریعے ہر ایک کو تکریم و خدمتِ انسانیت کی اس سرگرمی میں شامل ہونے اور ہر محروم تک پہنچنے کی ترغیب دیتی ہیں۔ ان کی سرگرمیوں میں جہاں عام حالات میں بھوک مٹانے اور بے کسوں کی دستگیری کے لیے متعدد کام شامل ہیں، جنگوں اور قدرتی آفات میں بھی ہر تفریق سے بالاتر ہو کر انسانیت کی خدمت ان تنظیموں کا عام شعار ہے۔

باب ۶

پاکستان میں خدمتِ خلق اور اصول برائے تکریمِ انسانیت

پاکستان کا شمار ان معاشروں میں ہوتا ہے جہاں کسی بھی اجتماعی آفت یا مصیبت کی صورت میں باہم تعاون اور مدد کا جذبہ نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔ شاید اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ پاکستانی معاشرے کی بنیادی اقدار میں قرآن اور حدیث کی تعلیمات کی چھاپ بہت گہری ہے اور ان تعلیمات کے مطابق خوف، بھوک، مال و جان اور زرعی پیداوار کا نقصان انسانی زندگی میں اللہ کی جانب سے آزمائش کی شکل ہیں اور ایسے کسی نقصان کی صورت میں صبر کرنا، اور اللہ پر اپنے ایمان کا اعادہ کرتے ہوئے ایک دوسرے کا دست و بازو بننا مسلم معاشرے کی شناخت ہے۔

یہ بھی درست ہے کہ انسان اپنی کوتاہیوں اور غلطیوں سے بھی بہت سی مشکلات مول لے لیتا ہے اور اپنے لیے اور اللہ کے دوسرے بندوں کے لئے مشکلات و مسائل پیدا کرتا ہے۔ قوموں کے باہمی تنازعات جب جنگوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو اس سے بڑے انسانی المیے جنم لیتے ہیں۔ گزشتہ صدی میں دو بڑی جنگوں میں کروڑوں جانیں لقمۂ اجل بنیں اور اربوں انسان اس سے متاثر ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اقوام متحدہ کے قیام سے امید پیدا ہوئی کہ اقوامِ عالم کے درمیان تنازعات کا فیصلہ باہمی صلاح و مشورے سے ہوا کرے گا اور اس طرح بڑے پیمانے پر جنگوں کا خاتمہ ہو گا اور اس سے عام انسانوں کی

زندگیوں کو لاحق مشکلات و خطرات سے نجات ملے گی۔ لیکن افسوس کہ ایسا ممکن نہ ہو سکا اور اس وقت بھی کئی خطوں میں جنگ کی آگ بھڑک رہی ہے جس کا ایندھن انسانی آبادیاں بنی ہوئی ہیں۔

جنگ عظیم دوئم میں وسیع پیمانے پر تباہی کے بعد ۱۹۴۹ء میں تشکیل پانے والے بین الاقوامی قانون برائے تکریمِ انسانیت کا مقصد بھی دورانِ جنگ بیمار، زخمی یا پھر معذور ہونے کی صورت میں محاربین کے حقوق اور جنگی قیدیوں، عام شہریوں اور غیر مقاتلین کی سلامتی کو حتی الامکان یقینی بنانا ہے۔ جنگ کے جواز اور عدم جواز سے قطع نظر اس قانون کا ہدف یہ ہے کہ جنگ میں انسانیت کے تقاضوں کا حتی الامکان لحاظ رکھا جائے اور جنگ کے نقصانات کو ممکنہ حد تک محدود کیا جائے۔

جنگوں کے علاوہ قدرتی آفات جن میں بڑے پیمانے پر ہلاکتیں ہوتی ہیں، بستیاں اور ملک تباہ و برباد ہو جاتے ہیں اور بڑے پیمانے پر انسان بے گھر اور بے آسرا ہو جاتے ہیں، ان میں بھی انسانیت کو یکجا ہو کر نقصانات کے ازالہ کے لیے جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ اگرچہ زلزلے، سمندری طوفان، سیلاب، آتش فشاں پہاڑ پھٹنے، موسمیاتی تبدیلیوں، وبائی امراض، قحط سالی، آتشزدگی وغیرہ سے دنیا کے تمام ہی خطوں میں انسان متاثر ہوتے ہیں لیکن تیسری دنیا کے غریب ممالک اپنی کمزور معیشت اور ناکافی سہولیات کی وجہ سے زیادہ نقصان اٹھاتے ہیں۔

مسلم دنیا میں جب تک خلافت کا نظام قائم رہا، اس وقت تک ریاست میں موجود ضرورت مندوں کی خبر گیری مسلم حکومت کی ذمہ داری رہی اور بیت المال کا اہم ترین استعمال جمع شدہ صدقات، زکاۃ، عشر اور دیگر آمدن سے ناداروں، غریبوں، محتاجوں اور ضرورت مندوں کی دیکھ بھال تھا۔ نوآبادیاتی دور نے نہ صرف مسلم ریاستوں کا خاتمہ کیا بلکہ

ان کے بنیادی ڈھانچے کو ہمیشہ کے لیے تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اگرچہ جدید ریاستی بندوبست کے تحت بھی فلاحی ریاست (Welfare state) کا تصور ریاست کو فرد کی دیکھ بھال کی ذمہ داری دیتا ہے تاہم بیشتر مسلم ممالک کے لیے اس ہدف کا حصول اب تک ممکن نہیں ہو پایا۔

دستورِ پاکستان کی تمہید (قراردادِ مقاصد) کے مطابق جمہوریت، آزادی، مساوات، رواداری اور عدلِ اجتماعی کے اصولوں کو اسلام کی تعلیمات کے مطابق بروئے کار لانا ہمیشہ سے ریاست کی ذمہ داریوں میں شامل سمجھا گیا ہے اور خود ۱۹۷۳ء کے دستور میں بھی بنیادی حقوق اور حکمتِ عملی کے اصولوں میں ایسے متعدد رہنما نکات موجود ہیں جن کے مطابق بلا تفریقِ رنگ، نسل اور مذہب ہر فرد کی جان، مال، عزت و آزادی کا تحفظ ریاست کی ذمہ داری ہے۔ تاہم یہ بھی معلوم ہے کہ پاکستان ایسے ممالک میں شامل ہے جہاں حکومتیں مختلف وجوہ کی بناء پر اپنی تمام ذمہ داریاں پوری نہیں کر پاتیں اور جہاں صحت و سلامتی کی سہولتیں قابلِ رشک نہیں۔ ایسے میں حکومتی اداروں کے ساتھ غیر سرکاری فلاحی اداروں کا کردار بہت اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔

پاکستان میں ایسے اداروں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے جو سرکاری سرپرستی اور کسی بڑے مالیاتی تعاون کے بغیر معاشرتی و انفرادی فلاح کی کوششوں میں مصروف ہیں۔[1] تاہم اس وقت ان میں سے صرف ریڈ کراس، ہلالِ احمر اور مذہب کی بنیاد پر انسانی خدمات کا مختصر تذکرہ ہی مقصود ہے۔

[1] مختلف شعبوں میں انسانی خدمات سرانجام دینے والے اداروں اور تنظیموں کی ایک فہرست یہاں دیکھی جا سکتی ہے: http://pcp.org.pk/pagestyle.php

ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کا کردار

جنگی حالات میں تکریمِ انسانیت کے معیارات اور طریقوں کے غیر جانبدارانہ اطلاق اور نفاذ کے لیے تشکیل دی گئی ریڈ کراس اور ہلال احمر (Red Cross and Red Crescent) کی عالمگیر تحریک اجتماعی انسانی آفات میں بھی انسانی خدمت کے لیے کوشاں ہے۔ یہ تحریک رضاکاروں کے وسیع جال کے ساتھ تمام ممالک میں موجود اور سرگرم ہے۔ پاکستان میں ریڈ کراس اور ہلالِ احمر کی سرگرمیوں کا آغاز ۱۹۴۷ء میں ہی ہو گیا تھا۔ ہلالِ احمر پاکستان کی بنیاد پاکستان کے پہلے گورنر جنرل کی حیثیت سے قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ نے ۲۰ دسمبر ۱۹۴۷ء کو ایک حکم نامے کے ذریعے رکھی۔ اس حکم نامے کی رُو سے قائدِ اعظمؒ اس انجمن کے بانی صدر بھی تھے، جب کہ انجمن کا نام پاکستان ریڈ کراس سوسائٹی تھا، جو بعد میں تبدیل ہو کر انجمن ہلالِ احمر بنا۔ بین الاقوامی ریڈ کراس کمیٹی (ICRC) نے ۱۹۴۸ء میں لاہور میں اپنا دفتر قائم کیا اور ہندوستان سے آنے والے مہاجرین کی مدد میں کردار ادا کیا۔ بعد ازاں کشمیر میں ہونے والی جنگ اور پنجاب کی تقسیم سے پھوٹ پڑنے والے فسادات کے بعد اس تحریک نے نہ صرف پاکستان، ہندوستان اور آزاد کشمیر کی حکومتوں سے رابطہ کر کے انہیں عام افراد، غیر محاربین اور جنگی قیدیوں سے متعلق عالمی جنگی قوانین کے اطلاق پر آمادہ کیا بلکہ مہاجرین کے لیے بنیادی اور طبّی سہولیات کی فراہمی، قیدیوں کی دیکھ بھال اور تقسیم شدہ خاندانوں کو ملانے میں اہم کردار ادا کیا۔[2] بعد ازاں ۱۹۶۵ اور ۱۹۷۱ کی جنگوں میں بھی

[2] Catherine Rey-Schyrr, "The ICRC's activities on the Indian subcontinent following partition (1947-1949)," *International Review of the Red Cross*, no. 323, June 30, 1998, https://www.icrc.org/en/doc/resources/documents/article/other/57jpcb.htm

ریڈ کراس نے ایک غیر جانبدار ادارے کے طور پر عام شہریوں کے تحفظ، جنگی قیدیوں کے حقوق اور بکھرے ہوئے خاندانوں کو ملانے کے حوالے سے گراں قدر خدمات سرانجام دیں۔ انسانی خدمت اور بین الاقوامی تعاون اور یگانگت کا یہ سلسلہ بعد میں آنے والی قدرتی آفات، افغانستان میں جنگ کے مختلف ادوار، اور حال ہی میں کورونا وائرس کے تباہ کن اثرات سے نمٹنے تک جاری ہے۔ پاکستان کے اندر سانحات کے شکار طبقات کی مدد کے لیے انجمن ہلالِ احمر پاکستان وفاقی اور صوبائی دارالحکومتوں کے ساتھ ساتھ کشمیر میں بھی اپنی شاخیں رکھتی ہے، جب کہ ۱۹۲ اضلاع میں بھی انجمن کی شاخیں کام کر رہی ہے۔ متاثرین کی مدد، قدرتی آفات سے نمٹنا، طبّی نگہداشت، انسانی اقدار کے فروغ، خاندانی روابط کی بحالی، ایمبولینس سروس کی فراہمی، بلڈ بنک اور ابتدائی طبّی امداد جیسے امور انجمن ہلالِ احمر پاکستان (PRCS) کی سرگرمیوں میں شامل ہیں۔ اس وقت ہلالِ احمر پاکستان کے ساتھ تقریباً ۱۸ لاکھ رضاکار وابستہ ہیں۔[3]

مذہب کی بنیاد پر انسانی خدمت

اگرچہ انسانی معاشروں میں باہمی تعاون اور ناداروں کی مدد کا اہتمام ہر دور میں ہی جاری رہا ہے لیکن انہیں ایک باقاعدہ منظم اور مرتب شکل دینے میں مسیحی مشنری اداروں کا کردار غیر معمولی ہے۔ اس کا ایک بڑا سبب چرچ کے ادارے کا ریاست کے دیگر اداروں سے بڑی حد تک غیر جانبدار اور خود مختار ہونا بھی تھا۔ مذہب کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ صحت و تعلیم کے شعبوں میں ان تنظیموں اور اداروں کی خدمات بے پناہ ہیں۔ اس مقصد کے تحت تقریباً ہر چرچ کے ساتھ معیاری سکول قائم کیے گئے۔ صحت کے میدان میں انہوں نے بالخصوص

[3] دیکھیے: Pakistan Red Crescent Society, PRCS Intro, prcs.org.pk

امراضِ چشم اور جذام کے مرض کے علاج پر توجہ دی۔ یہ دونوں شعبے حضرت مسیحؑ کے معجزات سے تعلق رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے حکم سے نابینا اور کوڑھی کا علاج کیا کرتے تھے۔ ان عیسائی اداروں کا چندہ چرچ میں موجود بکسوں کی آمدن سے ہوتا تھا۔ لیکن وقت کے ساتھ انھوں نے ترقی کی اور MSF اور OXFAM جیسے عالمی فلاحی ادارے وجود میں آئے۔

انسانی خدمت کے میدان میں مسلم دنیا کی منظم اور مرتب کوشش ۱۹۸۰ء کی دہائی میں نظر آئی جب ۱۹۷۹ء میں شروع ہونے والی افغانستان پر روسی جارحیت بڑے پیمانے پر تباہی و بربادی کا سبب بنی۔ روسی بمبار جہازوں نے سینکڑوں میلوں پر پھیلی ہوئی بستیوں کو ملیامیٹ کر دیا۔ بڑے پیمانے پر کلسٹر بموں، نیپام بموں، کھلونا بموں، بارودی سرنگوں اور دیگر تباہ کن اسلحہ کے استعمال نے لاکھوں افغان باشندوں کو اپنا گھر بار چھوڑنے پر مجبور کیا اور ان مہاجرین نے پڑوسی ممالک پاکستان، ایران اور دیگر ممالک کا رخ کیا۔ ان ممالک نے ان مہاجرین کو اسلامی اخوت کے جذبے کے تحت پناہ دی۔ ۶۰ لاکھ بے گھر افراد کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے لئے اقوامِ متحدہ کے اداروں، حکومتوں اور پوری آزاد دنیا کے فلاحی اداروں نے پاکستان کا رخ کیا۔ یہی وہ دور ہے کہ امریکی اور یورپی ممالک کی غیر سرکاری تنظیموں کے ساتھ ساتھ عرب ممالک کے رضاکار اور مخیر حضرات امدادی سرگرمیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ سعودی عرب، کویت، بحرین، سوڈان اور کئی دیگر ممالک نے امدادی تنظیمیں بنا کر عارضی پناہ گاہ، خوراک، پوشاک، صحت، تعلیم اور پانی کے شعبوں میں مہاجرین کی خدمت کی۔

اس کے بعد کے ادوار میں یورپی ممالک میں مقیم مسلم کمیونٹی نے بھی ان فلاحی اداروں کی تشکیل میں دلچسپی لی اور اپنی زکاۃ کی رقوم سے انھیں بنایا۔ جس کی وجہ سے ہر

بڑے ملک میں ایسے فلاحی ادارے وجود میں آئے جنھوں نے عالمی سطح پر کام کرنا شروع کیا اور شروع ہی سے بین الاقوامی قوانین، مالی ضابطوں اور مسلمہ اصولِ انسانیت کو ملحوظ رکھا۔ لیکن ان اداروں کی تنظیمی ہیت محدود اور مالی حجم بہت کم تھا اس لئے پہلے سے موجود عیسائی اداروں کے مقابلے میں ان کا کام محدود تھا۔ لیکن اب صورت حال میں تبدیلی آرہی ہے اور مسلم اداروں کی کارکردگی میں مسلسل اضافہ ہورہا ہے۔

افغانستان کے بعد بوسنیا ہرزگووینا، کوسووو، چیچنیا، صومالیہ، روہنگیا میانمار اور اب مقبوضہ کشمیر اور ہندوستان میں ہونے والے انسانیت کش واقعات نے مسلم دنیا کو جھنجوڑ کر رکھ دیا ہے۔ خاص طور پر فلسطین اور شام کے اندوہناک واقعات نے مسلمان ملت میں ایثار و قربانی کے جذبات پیدا کیے ہیں جس کی وجہ سے شخصی اور اجتماعی دونوں سطح پر اس کا مظاہرہ دیکھنے کو مل رہا ہے۔

پاکستان میں خدمتِ خلق

پاکستان میں انفرادی سطح پر باہمی تعاون اور خدمت کا ایک رجحان موجود ہے جب کہ صدقات، خیرات اور عملی مدد کا بھی بڑا حصہ بغیر کسی مرتب شکل کے جاری رہتا ہے۔ تاہم برصغیر پاک وہند میں آزادی سے قبل بھی کئی روایتی اور غیر روایتی ادارے غریبوں، بے کسوں، مساکین، یتامیٰ اور بیواؤں کی خدمت کے لئے کام کررہے تھے۔ عیسائی مشنری ادارے، مسلم یتیم خانے، مدارس اور آشرم کا نظام قائم تھا۔ مخیر لوگ وقف کے نظام کے تحت اپنی جائیدادیں خدمت خلق کے لئے وقف کردیتے تھے جو سالہا سال متعین انداز میں مخلوقِ خدا کو فائدہ پہنچاتے رہتے۔ درباروں میں لنگر کا انتظام ہوتا تھا جہاں سے غریب مفت کھانا کھا سکتے تھے۔ یہ سلسلہ اب بھی ملک کے مختلف حصوں میں جاری ہے۔ تعلیم و صحت

کے میدان میں خاص طور پر مسلمانوں، ہندوؤں اور پارسیوں کے وقف کردہ ادارے خدمات سرانجام دیتے آئے ہیں۔ مسلمانوں کے مشہور تعلیمی ادارے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، سندھ مدرسۃ الاسلام کراچی اور اسلامیہ کالج پشاور انہی وقف اداروں اور مسلمانوں کی اجتماعی کاوش کا نتیجہ ہیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد انسانی خدمات کا یہ سلسلہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر جاری رہا اور بڑی تعداد میں رفاہی تنظیمیں اور ادارے وجود میں آئے۔ مذہبی اداروں کا انتظام وانصرام، شفاخانے، مریضوں کی منتقلی، قبرستان، کتب خانے، تعلیمی ادارے، فراہمی آب، کھانا کھلانا، قیدیوں کی فلاح اور دیکھ بھال، گمشدہ افراد کی تلاش میں معاونت جیسی کتنی ہی سرگرمیاں ہیں جو معاشرتی سطح پر غیر سرکاری عوامی تعاون کی بنیاد پر جاری رہتی ہیں۔ ایسے چند مواقع جن پر تکریمِ انسانیت کی سرگرمیاں اور پاکستانی عوام کی ان میں شرکت نمایاں طور پر نظر آئی، ان کا تذکرہ ذیل میں مختصراً کیا گیا ہے:

۲۰۰۵ء کا تباہ کن زلزلہ

اجتماعی انسانی خدمت کا ایک بہت بڑا مرحلہ اس وقت پیش آیا جب ۸ اکتوبر ۲۰۰۵ء کو شدید زلزلے نے آزاد کشمیر اور صوبہ خیبر پختونخوا کے شمالی اضلاع میں بے پناہ تباہی برپا کی۔ اس تباہ کن زلزلے کے نتیجے میں تقریباً ۸۰ ہزار افراد جاں بحق ہوئے، جن میں ۱۸ ہزار سکولوں کے بچے بھی شامل ہیں۔ چونکہ صبح ۹ بجے یہ زلزلہ پیش آیا تھا اس لیے اسکولوں کے طلبہ وطالبات خاص طور پر نشانہ بنے۔ ماہِ رمضان میں آنے والے اس زلزلے کی خبر دنیا بھر میں پھیل گئی اور پوری دنیا حقیقتاً امداد کے لئے دوڑ پڑی۔ پاکستان کے کونے کونے سے لوگوں نے امدادی سامان بھیجا اور دنیا کے ہر ملک سے امداد کے علاوہ رضاکار پہنچے۔ اگرچہ

تباہی بھی بہت بڑے پیمانے پر ہوئی تھی تاہم اس کے مقابلے کے لیے سامنے آنے والا جذبہ خیر سگالی بھی غیر معمولی تھا۔ بہت زیادہ مقدار میں وصول ہونے والے امدادی سامان کی ترسیل، اسے سنبھالنا، تقسیم کرنا، اور ہزاروں کی تعداد میں ملک اور دنیا بھر سے آنے والے رضاکاروں کو بہتر طور پر استعمال کرنا ایک ایسا کام تھا جس نے امدادی اداروں کی تعداد اور صلاحیت میں اور ان کی مل کر کام کرنے کی صلاحیت میں بے پناہ اضافہ کیا۔ اس لحاظ سے پاکستان میں فلاحی اداروں کی تاریخ میں یہ ایک غیر معمولی موقع (Epic event) تھا جو ایک قدرتی آفت کے نتیجہ میں میسر آیا۔

۲۰۱۰-۱۱ء کے تباہ کن سیلاب

ایسا ہی لیکن اپنی نوعیت میں یکسر مختلف ایک اگلا بڑا چیلنج اس وقت پیش آیا جب ۲۰۱۰ء اور ۲۰۱۱ء کے سیلابوں نے صوبہ خیبر پختونخوا، پنجاب اور سندھ کے بڑے حصوں کو شدید متاثر کیا۔ مون سون کی شدید بارش اور بادلوں کے پھٹنے (Cloud burst) سے بننے والے سیلابی ریلے نے مکانوں، ہوٹلوں، پلوں، سڑکوں غرض راستے میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو تہس نہس کر دیا۔ کھربوں روپے کا نقصان اور انسانوں جانوں کا ضیاع ہوا۔ سندھ میں کئی ماہ تک زیریں اضلاع میں پانی کھڑا رہا اور لاکھوں انسانوں کو بے گھر ہونا پڑا۔ ان دونوں مواقع پر بھی بڑے پیمانے پر امدادی سرگرمیاں دیکھنے کو ملیں جس میں حکومتوں، سرکاری اداروں، افواج پاکستان، بین الاقوامی اداروں کے ساتھ فلاحی اداروں کا کردار بھی بہت واضح رہا۔ دور دراز دیہات میں بھی اپنی زمینوں، گھروں، مال و اسباب اور مویشیوں سے محروم ہو جانے والے خاندانوں تک پہنچ کر نہ صرف ایک بڑی تعداد کو بچایا گیا اور وبائی امراض کو پھیلنے سے

روکا گیا، بلکہ بحالی اور تعمیرِ نو کے ذریعے زندگی کو دوبارہ اس کی ڈگر پر ڈالنے میں بھی ان فلاحی ورفاہی اداروں کا کردار اہم رہا۔

دہشت گردی اور داخلی پناہ گزینوں کا مسئلہ

پاکستان کی قومی تاریخ کا ایک اور المناک باب ۲۰۰۱ء میں افغانستان پر امریکی حملے کے بعد وسیع تر پیمانے پر دہشت گردی اور اس کے خلاف جنگ کے نام پر ہونے والی تباہی ہے۔ اکیسویں صدی کی پہلی ڈیڑھ دہائی سے زیادہ کا عرصہ پاکستان میں دہشت گردی، لاقانونیت اور بدامنی کا گزرا جس میں بم دھماکوں، خودکش حملوں، ٹارگٹ کلنگ جیسے واقعات ایک معمول بن گئے تھے۔ تین صوبائی دارالحکومت کراچی، کوئٹہ اور پشاور خاص طور پر نشانہ بنے۔ ان حملوں میں عسکری اور پولیس کے عملہ کے ساتھ عام لوگ بھی نشانہ بنتے۔ خاص طور پر ۱۶ دسمبر ۲۰۱۴ء کو پشاور کے آرمی پبلک اسکول میں ۱۵۰ معصوم بچوں اور اساتذہ کو نشانہ بنا کر جس بہیمانہ انداز میں قتل کیا گیا وہ پاکستانی تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔ اگرچہ اس کے بعد قومی شعور کی بیداری کی وجہ سے مقتدر حلقوں نے تخریب کاروں کے خلاف فیصلہ کن کاروائی کی لیکن بہر کیف یہ پورا عرصہ پاکستان کے لئے ایک بڑی آزمائش ثابت ہوا۔ اس کے ساتھ ساتھ ایسے ہر واقعہ کے بعد مقامی افراد اور تنظیموں کا جذبۂ ایثار و قربانی بھی دیکھنے میں آیا۔ متاثرہ افراد کو تباہ شدہ عمارات یا گاڑیوں سے نکال کر ہسپتال پہنچانے، خون دے کر زخمیوں کی جانیں بچانے اور بعد ازاں بحالی و تعمیرِ نو میں حکومتی اداروں کی معاونت میں ہر جگہ مقامی آبادی اور رفاہی تنظیمیں کردار ادا کرتی رہیں۔

۲۰۰۴ء سے ۲۰۱۴ء تک سوات، بونیر اور قبائلی اضلاع میں تخریب کاری کے خلاف فوجی ایکشن کی وجہ سے بڑے پیمانے پر آبادی کا انخلا ہوا اور داخلی طور پر پناہ گزین ان افراد کو

Internally Displaced Persons یا IDPs کے نام سے تعبیر کیا گیا۔ جنوبی وزیرستان سے شروع ہونے والا آبادی کا انخلا باجوڑ، مہمند، سوات، بونیر، خیبر، اورکزئی، درہ آدم خیل اور شمالی وزیرستان تک جاری رہا جس میں ۳۵ لاکھ کے لگ بھگ آبادی کو اپنا گھر بار چھوڑنا پڑا اور معاشی و سماجی بدحالی کا سامنا رہا۔ پشاور، مردان، صوابی، مالاکنڈ، بنوں، نوشہرہ سمیت کئی دیگر اضلاع میں بڑے بڑے IDPs کیمپ آباد ہوئے۔ بعد میں ۲۲ لاکھ افراد کو امدادی فنڈز کے اجرا کے لئے رجسٹر کیا گیا۔ ان داخلی مہاجرین کی خدمت کے لئے بھی مقامی لوگوں کے ساتھ فلاحی اداروں نے کام کیا اور صحت، خوراک، لباس و دیگر ضروریاتِ زندگی کی فراہمی میں اپنا کردار ادا کیا۔

کووڈ-۱۹ کا عالمی بحران

کرونا وائرس نے ۲۰۱۹ء کے اواخر سے دنیا بھر میں انسانی زندگی کو کئی طرح سے متاثر کیا ہے۔ اس مہلک وائرس نے انسانیت کو ایک منفرد چیلنج کا شکار کر دیا ہے اور بڑی تعداد میں ہلاکتوں کا سبب بنا ہے۔ اس سلسلے میں جہاں متاثرہ افراد کی فوری شناخت اور پوری احتیاط سے ان کی طبّی مرکز منتقلی یا قرنطینہ (Quarantine) میں رکھنا ایک کل وقتی کام ہے وہاں اس کے پھیلاؤ کو روکنے کے لیے غیر معمولی احتیاط کی بھی ضرورت ہے۔ ان حالات سے نمٹنے کے لیے جہاں ملک کے تمام ہی سرکاری اور غیر سرکاری وسائل اپنائے گئے، وہاں انٹرنیشنل ریڈ کراس کمیٹی پاکستان نے ملک بھر میں طبّی شعبے کو مضبوطی فراہم کرنے کے لیے اہم کردار ادا کیا۔ جب کہ انجمن ہلالِ احمر پاکستان نے بھی فوری طبّی امداد اور محافظ فورس کی تشکیل کے ساتھ ساتھ عوامی آگہی، راشن کی تقسیم اور تحقیق کی غرض سے معلومات جمع کرنے میں دل جمعی سے کام کیا۔

اس کے علاوہ ملک میں ایسے چھوٹے بڑے واقعات پیش آتے رہتے ہیں جن کی فوری امداد میں سرکاری ادارے، قومی و صوبائی ڈیزاسٹر منیجمنٹ کے ادارے، فوج، ریسکیو ۱۱۲۲ کے ساتھ فلاحی انجمنیں، ایدھی، چھیپا، الخدمت، فلاح انسانیت بھی پوری طرح شریک ہوتے ہیں۔

امدادی کاموں میں عوامی دلچسپی

اجتماعی امدادی سرگرمیوں میں عام لوگوں کی دلچسپی بڑھتی جارہی ہے اور اس لحاظ سے فلاحی اداروں پر اعتماد اور شراکت میں اضافہ ہوا ہے۔ پاکستان میں بالعموم صدقہ و خیرات کا رجحان بہت اچھا ہے۔ ایک سروے کے مطابق پاکستان میں سالانہ ۲۴۰ بلین روپے خیرات و صدقات کی مد میں دیے جاتے ہیں۔ انفرادی مدد کے ساتھ اداروں کے ساتھ تعاون میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ عبدالستار ایدھی کی شخصیت اور کارکردگی نے بلا تفریق، بے لوث اور ان تھک خدمت کے اس رجحان کو عام بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

آزاد میڈیا، برقی چینل کا کردار

آزاد میڈیا، برقی چینل، مواصلاتی اور سماجی روابط کے ذرائع کے استعمال نے انسانی مسائل کو اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ چھوٹے بڑے واقعات بھی رپورٹ ہو رہے ہیں جس سے انسانی ہمدردی کے مظاہرے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پاکستانی عوام نے نہ صرف اپنے ہم وطنوں بلکہ دیگر ممالک میں آفت زدہ افراد کی مدد کے لیے بھی ہمیشہ خود کو تیار پایا ہے اور پاکستان سے تعلق رکھنے والی رفاہی و فلاحی تنظیموں نے دنیا کے مختلف حصوں کے انسانی

مصائب کو دور کرنے میں کردار ادا کیا ہے۔ ان میں فلسطین، کشمیر، شام، بوسنیا، سری لنکا، بنگلہ دیش، میانمار، یمن، نیپال، جاپان وغیرہ شامل ہیں۔

اسلامی فلاحی اداروں کی خدمات

اسلامی فلاحی انجمنیں عام لوگوں سے تھوڑا تھوڑا چندہ جمع کر کے متاثرہ علاقوں میں جا کر کام کرتی ہیں اور متاثرین کی خدمت کرتی ہیں۔ ان کی کارکردگی کی رپورٹ امداد دینے والے (Donor) خواتین و حضرات کو مل جاتی ہے جس سے ان کا اعتماد بحال رہتا ہے۔ ان اداروں میں اکثر کام کرنے والے رضاکارانہ طور پر کام کرتے ہیں۔ اس طرح ان کو معاشرے میں عزت کا مقام ملتا ہے اور وہ اطمینان سے اپنی خدمات سر انجام دیتے ہیں۔ ان خدمات کی تفصیل درجہ ذیل ہے۔

۱۔ قدرتی آفات یا انسان کے پیدا کردہ عام مصائب کے وقت فوری طور پر امدادی سرگرمیوں کے لئے موقع پر پہنچنا۔

۲۔ عارضی پناہ گاہیں بنانے کے لئے خیمے، ترپال، کھانے پینے کے سامان کا بندوبست کرنا۔

۳۔ متاثرین کے کیمپوں میں انتظامات، خوراک، پوشاک، ادویات اور دیگر سہولتوں کی فراہمی میں حصہ لینا۔

۴۔ یتیم ہونے والے بچوں کی کفالت اور تعلیم کا بندوبست

۵۔ صحت کی سہولتوں کی فراہمی، ابتدائی طبّی امداد، زچہ بچہ کے مراکز

۶۔ ایمبولینس سروس کی فراہمی۔

۷۔ سردی میں لحاف، بستر، کمبل وغیرہ کی تقسیم

۸۔ راستوں کی دیکھ بھال، پانی کے کنوؤں کی کھدائی اور صاف پانی کی ترسیل کا بندوبست

۹۔ قیدیوں کی فلاح، تعلیم وتربیت، قانونی امداد اور جرمانوں کی ادائیگی

۱۰۔ مذہبی تہواروں مثلاً رمضان المبارک، عید، دیوالی، کرسمس وغیرہ کی خوشیاں معاشرے کے تمام متعلقہ طبقات تک پہنچانے کی کوشش

۱۱۔ وھیل چیئرز، بیساکھیاں، مصنوعی اعضاء کی فراہمی سے معذوروں کی مدد

۱۲۔ کپڑے، کتب ودیگر اشیائے ضرورت کی تقسیم

۱۳۔ بلاسود قرضہ جات کی اسکیم: چھوٹے کاروبار اور زراعت میں معاونت

۱۴۔ فوڈ پیکج، خشک غذائی مواد کی تقسیم، عوامی دستر خوان، غریبوں کو کھانا کھلانا جیسی سرگرمیاں

۱۵۔ نادار افراد کی شادی کا اہتمام اور جہیز کی فراہمی وغیرہ

طب کے شعبے سے وابستہ افراد بھی نہ صرف اپنے پیشہ ورانہ فرائض کے طور پر دن رات انسانیت کی خدمت کرتے ہیں بلکہ رضاکار تنظیموں کے طور پر اور ان کے ساتھ مل کر عام حالات میں اور مصائب کے وقت آگے بڑھ کر ضرورت مندوں کی تکالیف کا مداوا

کرتے ہیں۔ اس لیے کسی بھی عام آفت کی صورت میں مفت طبّی امداد کے کیمپس یا ہنگامی شفاخانے (Field hospitals)، ادویات کی فراہمی حتی کہ جراحت (Surgery) کا اہتمام بھی رفاہی سرگرمیوں کا معمول کا حصہ ہیں۔ پاکستان کے طبّی ماہرین بیرونِ ملک انسانی خدمت کے لیے بھی سرگرم رہتے ہیں اور بعض اوقات انہیں جنگ کے حالات میں بھی خدمات سرانجام دینا پڑتی ہیں جیسے شام اور بوسنیا وغیرہ میں۔ ایسے میں تکریمِ انسانیت کے اصول اور طبّی اخلاقیات یکجا ہو جاتے ہیں جن کے تحت رضاکارانہ خدمت کرنے والے یہ افراد بلا تفریقِ رنگ، نسل اور مذہب انسانیت کی خدمت سرانجام دے پاتے ہیں۔

یہ تمام ادارے مختلف مسلمان معاشروں میں کام کرتے ہوئے عام لوگوں سے زکاۃ، صدقات و عطیات، فطرانے اور قربانی کی صورت میں تعاون حاصل کرتے ہیں۔ بالعموم یہ ادارے متعلقہ حکومتی انتظام کے تحت رجسٹرڈ ہیں اور بین الاقوامی قوانین، بنکاری، آڈٹ اور مسلمہ اصول انسانیت کی پاسداری کرتے ہیں۔ ان میں سے کئی ادارے اقوام متحدہ اور دیگر عالمی اداروں سے تعاون حاصل کر کے علاقوں اور لوگوں کی ترقی میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔

مذہب کی بنیاد پر خدمت اور عالمگیریت، غیر وابستگی و غیر جانبداری کے اصول

پاکستان میں مذہب کی بنیاد پر قائم اداروں نے بارہا اس تاثر کو غلط ثابت کیا ہے کہ اس نوعیت کے ادارے عالمگیریت، غیر جانبداری اور غیر وابستگی کے اصولوں کے تحت انسانیت کی عام خدمت نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ رضاکارانہ جذبے کے تحت جاری رفاہی و فلاحی سرگرمیوں نے افراد کی ضرورت کی بنیاد پر اپنی ترجیحات کا تعین کیا ہے نہ کہ ان کے رنگ،

نسل، مذہب یا سیاسی وابستگی کی بنیاد پر۔ یہ ادارے مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی امداد پہنچاتے ہیں۔ اپنی انتظامی لاگت کو کم از کم رکھتے ہوئے انسانیت کی خدمت کا یہ انداز اس لائق ہے کہ اسے باقاعدہ مطالعہ و تحقیق کا عنوان بنا کر ان تجربات کو عام کیا جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام میں نہ صرف بلا تفریق انسانی خدمت کی بے پناہ ترغیب موجود ہے بلکہ اس کے ادا کرنے پر اجر و ثواب اور اس سے اعراض کرنے پر جوابدہی کا احساس کسی بھی مسلمان کو آگے بڑھ کر مصیبت زدہ افراد کی تکلیف دور کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔

دوروزہ قومی کانفرنس بعنوان

'اسلام اور اصول برائے تکریمِ انسانیت'

(۲۷، ۲۸ اگست ۲۰۱۹) میں پیش کردہ مقالات

موضوع	مقالہ نگار
صلیب و ہلال احمر تحریک کا تاریخی پس منظر	ڈاکٹر محمد مشتاق احمد، ڈائریکٹر جنرل شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
اصول برائے تکریمِ انسانیت، اسلام اور جدید عالمی اقدار	ڈاکٹر زاہد صدیق مغل، اسسٹنٹ پروفیسر، نیشنل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، اسلام آباد
بین الاقوامی قانون انسانیت اور سیر۔ اصول انسانیت کا آفاقی تصور	ڈاکٹر محمد منیر، نائب صدر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد
بنیادی انسانی ذمہ داریاں، تکریم آدم اور آفاقیت۔ سیرت کی روشنی میں	ڈاکٹر سید عزیز الرحمان، نگران ریجنل دعوۃ سنٹر، کراچی۔ دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی۔
اصول برائے تکریمِ انسانیت، دستور پاکستان اور قوانین	ڈاکٹر شہزاد اقبال شام، سینئر ریسرچ فیلو، انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد

تکریمِ انسانیت: خواتین اور بچوں کے لیے پاکستانی قوانین	ڈاکٹر ثاقب جواد، سول جج/جوڈیشل مجسٹریٹ، اسلام آباد
داخلی مسلح تصادم کے دوران اصول تکریمِ انسانیت	ڈاکٹر عطاء الرحمان، عالمِ دین اور سماجی کارکن، خطیب جامع مسجد مولانا عبدالعزیز، کوئٹہ
دینی مدارس میں تعلیم اور اصول تکریمِ انسانیت	مولانا یاسین ظفر، سیکرٹری جنرل، وفاق المدارس السلفیہ، پاکستان
فرقہ وارانہ کشیدگی اور اصول تکریمِ انسانیت	مولانا ابو عمار زاہد الراشدی، ڈائریکٹر الشریعہ اکیڈمی، گوجرانوالہ
اسلامی فلاحی ادارے اور قدرتی آفات	ڈاکٹر محمد اقبال خلیل، سابق صدر پاکستان اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن
طبّی اخلاقیات اسلامی اصول واقدار اور اصول برائے انسانیت نیز پاکستان میں اس حوالے سے صورتِ حال	ڈاکٹر محمد اقبال خان، وائس چانسلر، شفا تعمیرِ ملت یونیورسٹی، اسلام آباد
پاکستان میں سانحات کے دوران رپورٹنگ اور میڈیا کا کردار	ڈاکٹر سید محمد انور، ایڈووکٹ سپریم کورٹ آف پاکستان؛ رکن اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان
اصول برائے تکریمِ انسانیت: زمینی حقائق، عملی کام اور مستقبل کے امکانات	عبدالشکور، صدر الخدمت فاؤنڈیشن پاکستان مفتی محمد عارف، ڈائریکٹر مذہبی امور، خبیب فاؤنڈیشن پاکستان

خصوصی گفتگو:

مفتی غلام الرحمان، مہتمم جامعہ عثمانیہ، پشاور

ڈاکٹر محسن نقوی، رُکن اسلامی نظریاتی کونسل، پاکستان

ڈاکٹر انیس احمد، وائس چانسلر رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر سہیل حسن، ڈائریکٹر جنرل، دعوۃ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر قبلہ ایاز، چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل، پاکستان

ڈاکٹر فرخندہ ضیاء، نائب صدر، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

ڈاکٹر عمیر صدیقی، اسسٹنٹ پروفیسر، یونیورسٹی آف کراچی

دیگر مصادر و مراجع

Haug, Hans. Review of "The Fundamental Principles of the International Red Cross and Red Crescent Movement." In Humanity for All, 443–90. Haupt: Henry Dunant Institute, 1993.

Lucy Salek, working in Conflict: A Faith Based Toolkit for Islamic Relief. Birmingham: Islamic Relief Worldwide. http://policy.islamic-relief.com/portfolio/working-in-conflict-a-faith-based-toolkit/

French, Michael, and Atallah Fitzgibbon. A Faith-Sensitive Approach in Humanitarian Response: Guidance on Mental Health and Psychological Programming. France: The Lutheran World Federation and Islamic Relief, 2018. https://interagencystandingcommittee.org/system/files/faith-sensitive_humanitarian_response_2018.pdf.

Al-Dawoody, Ahmed. "Islamic Law and International Humanitarian Law: An Introduction to the Main Principles." International Review of the Red Cross 99, no. 906 (2017): 995–1018. https://doi.org/10.1017/s1816383118000310.

Krafess, Jamal. Review of "The Influence of the Muslim Religion in Humanitarian Aid." International Review of the Red Cross 87, no. 858 (2005): 342. https://www.icrc.org/en/doc/assets/files/other/irrc_858_krafess.pdf#:~:text=The%20Muslim%20religion%20considers%20

عبد الحميد, عبد الغني. **2000**.حماية ضحايا النزاعات المسلحة في القانون الدولي الإنساني والشريعة الإسلامية.القاهرة: اللجنة الدولية للصليب الأحمر.

https://www.icrc.org/data/files/publications/ar/protection-of-armed-conflict-victims-1.pdf.

الزمالي, عامر. **2007**.مقالات في القانون الدولي الإنساني والإسلام .القاهرة: اللجنة الدولية للصليب الأحمر.

https://www.icrc.org/ar/publication/p2007_31_004.

Bernard, Vincent. "Editorial: The Humanitarian Ethos in Action." International Review of the Red Cross: Humanitarian Debate – Law, Policy, Action 97, no. 897/8 (2015). www.cambridge.org/core/journals/international-review-of-the-red-cross/article/humanitarian-ethos-in-action/210684AF 62680808436FF3803D22F2A2.

Salek, Lucy V. "Faith Inspiration in a Secular World: An Islamic Perspective on Humanitarian Principles." International Review of the Red Cross 97 no. 897–898 (2015): 345–70. https://doi.org/10.1017/s1816383115000600.

انٹرنیشنل کمیٹی آف ریڈ کراس

۱۸۶۳ء میں وجود میں آنے والی انٹرنیشنل کمیٹی آف دی ریڈ کراس (آئی سی آر سی) دنیا کی سب سے بڑی اور سب سے پرانی انسانی فلاحی تنظیم ہے۔ تین بار نوبل پرائز کی حق دار ٹھہرنے والی یہ تنظیم مسلح تصادم اور تشدد کی دوسری صورتوں میں متاثر ہونے والے لوگوں کی مدد فراہم کرتی ہے۔ آئی سی آر سی ۸۰ سے زائد ممالک میں اپنی سرگرمیاں انجام دیتی چلی آ رہی ہے۔

آئی سی آر سی تکریمِ انسانیت کے اصولوں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ۱۹۴۷ء سے پاکستان میں ضرورت مندوں کی مدد کر رہی ہے۔ یہاں آئی سی آر سی نے صحت، جسمانی بحالی، آفتوں سے نمٹنے کے لیے کمیونٹی ایجوکیشن، مسلح تصادم یا آفت کے نتیجے میں بچھڑنے والے پیاروں سے رابطے کی بحالی، بین الاقوامی قانونِ انسانیت اور ہنگامی حالات میں لاشوں کی انتظام کاری کے حوالے سے متعلقہ شعبوں میں پائیدار تبدیلیاں لانے کی کوشش کی ہے۔

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز

انسٹی ٹیوٹ آف پالیسی اسٹڈیز، اسلام آباد ایک آزاد، غیر سیاسی، علمی و تحقیق ادارہ ہے جو ملکی، بین الاقوامی مسائل اور اسلامی دنیا سے متعلق امور اور پالیسیوں پر تحقیق اور مکالمے کا اہتمام کرتا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ کے دائرۂ کار میں اقتصادی، معاشرتی، تعلیمی اور نظریاتی امور سے متعلق ملکی اور بین الاقوامی پالیسیاں شامل ہیں۔ ادارے کا مقصد متعلقہ امور پر مکمل آزادی کے ساتھ تحقیق اور مباحثہ کرنا اور مطالعہ اور غیر جانبدارانہ تجزیہ کی روشنی میں لائحہ عمل پیش کرنا ہے تا کہ پالیسی ساز ادارے اس کی روشنی میں بہتر فیصلے کر سکیں۔

ISBN 978-969-448-795-3

9 789694 487953

PRESS

www.ips.org.pk/ips-press